گلدستۂ نظم

مرتبہ

جناب مولوی محمد حُسین صاحب

ایم - اے - بی - ٹی (علیگ)

پبلشرز

رائل ایجوکیشنل بکڈپو - جامع مسجد

دہلی

قیمت

عہ

302

فہرست

رباعیات

مخمسات

ترکیب بند

قصائد

نظم جدید

غزلیات

میر محمد تقی میر

(ولادت سنہ ۱۱۲۵ھ آگرہ وفات سنہ ۱۲۲۵ھ لکھنؤ)

تھا مستعار حسن سے اسکے جو نور تھا
خورشید میں بھی اس ہی کا ذرہ ظہور تھا

ہنگامہ گرم کن جو دلِ ناصبور تھا
پیدا ہر ایک ذرہ سے شورِ نشور تھا

پہنچا جو آپ کو تو میں پہنچا خدا کے تئیں
معلوم اب ہوا کہ بہت میں بھی دور تھا

مجلس میں رات ایک ترے پرتوے بغیر
کیا شمع کیا پتنگ ہر اک بے حضور تھا

مُنعِم کے پاس قاقم و سنجاب تھا تو کیا
اُس رِند کی بھی رات کٹی جو کہ عور تھا

ہم خاک میں ملے تو ملے لیکن اے سپہر
اُس شوخ کو بھی راہ پہ لانا ضرور تھا

کل پاؤں ایک کاسۂ سر پر جو آگیا
یکسر وہ استخوانِ شکستہ سے چُور تھا

کہنے لگا کہ دیکھ کے چل راہ بے خبر
میں بھی کبھو کسی کا سرِ پُر غرور تھا

تھا وہ تو رشکِ حورِ بہشتی ہمیں میں میرؔ
سمجھے نہ ہم تو فہم کا اپنے قصور تھا

ایضاً

جس سر کو غرور آج ہے یاں تاجوری کا
کل اُسکو یہیں شور ہے پھر نوحہ گری کا

شرمندہ ترے رُخ سے ہے رخسار پری کا
چلتا نہیں کچھ آگے ترے کبک دری کا

آفاق کی منزل سے گیا کون سلامت
اسباب لٹا راہ میں یاں ہر سفری کا

زنداں میں بھی شورش نہ گئی اپنے جنوں کی
اب سنگ مداوا ہے اس آشفتہ سری کا

ہر زخمِ جگر داورِ محشر سے ہمارا
انصاف طلب ہے تری بیدادگری کا

اس رنگ سے جھکے ہے فلک پر کہ کہے تو
ٹکڑا ہے ترا اشک عقیق جگری کا

ٹک میرؔ جگر سوختہ کی جلد خبر لے
کیا یار بھروسہ ہے چراغ سحری کا

ایضاً

اُلٹی ہو گئیں سب تدبیریں کچھ نہ دوا نے کام کیا
دیکھا اِس بیماریِ دل نے آخر کام تمام کیا

عہدِ جوانی رورو کاٹا پیری میں لیں آنکھیں موند
یعنی رات بہت تھے جاگے صبح ہوئی آرام کیا

ناحق ہم مجبوروں پر یہ تہمت ہے مختاری کی
چاہتے ہیں سو آپ کریں ہیں ہم کو عبث بدنام کیا

یاں کے سفید و سیاہ میں ہم کو دخل جو ہے سو اتنا ہے

رات کو رو رو صبح کیا یا دِن کو جوں توں شام کیا
کام ہوئے ہیں سارے ضائع ہر ساعت کی سماجت سے
استغنا کی چوگنی اُن نے جوں جوں میں ابرام کیا
ایسے آہوئے رَم خوردہ کی وحشت کھونی مشکل تھی
سِحر کیا اعجاز کیا جن لوگوں نے تجھ کو رام کیا
میرؔ کے دین و مذہب کو اب پُوچھتے کیا ہو ان نے تو
قشقہ کھینچا دیر میں بیٹھا کب کا ترک اسلام کیا

خواجہ میر درد

(ولادت ۱۱۳۱ھ وفات ۱۱۹۹ھ دھلی)

اگر یوں ہی یہ دل ستاتا رہیگا
تو اِک دِن مرا جی ہی جاتا رہیگا

میں جاتا ہوں دل کو ترے پاس چھوڑے
مِری یاد تجھ کو دلاتا رہے گا

جفا سے غرض امتحانِ وفا ہے
تو کہہ کب تلک آزماتا رہے گا

قفس میں کوئی تم سے اے ہم صفیرو
خبر گُل کی ہم کو سناتا رہے گا

خفا ہو کے اے دردؔ مر تو چلا تو
کہاں تک غم اپنا چُھپاتا رہے گا

ایضاً

تہمت چند اپنے ذِمّہ دھر چلے
کس لئے آئے تھے ہم کیا کر چلے

زندگی ہے یا کوئی طوفان ہے
ہم تو اِس جینے کے ہاتھوں مر چلے

کیا ہمیں کام ان گلوں سے اے صبا
ایک دم آئے اِدھر اُودھر چلے

دوستو دیکھا تماشا یاں کا بس
تم رہو اب ہم تو اپنے گھر چلے

شمع کی مانند ہم اِس بزم میں
چشمِ نم آئے تھے دامن تر چلے

جوں شرارے ہستیِ بے بود یاں
بارے ہم بھی اپنی باری بھر چلے

ساقیا یاں لگ رہا ہے چل چلاؤ
جب تلک بس چل سکے ساغر چلے

دردؔ کچھ معلوم ہے یہ لوگ سب
کس طرف سے آئے تھے کیدھر چلے

سیّد انشاء اللہ خان۔ انشاؔ

(ولادت مرشد آباد۔ وفات لکھنو ۱۲۳۳ھ)

کمر باندھے ہوئے چلنے کو یاں سب یار بیٹھے ہیں
بہت آگے گئے باقی جو ہیں تیار بیٹھے ہیں

نہ چھیڑ اے نکہتِ بادِ بہاری راہ لگ اپنی
تجھے اٹھکھیلیاں سوجھی ہیں ہم بیزار بیٹھے ہیں

خیال اُن کا پرے ہے عرشِ اعظم سے کہیں ساقی
غرض کچھ اور دُھن میں اس گھڑی میخوار بیٹھے ہیں

بسانِ نقشِ پائے رہرواں کوئے تمنا میں
نہیں اٹھنے کی طاقت کیا کہیں لاچار بیٹھے ہیں

یہ اپنی چال ہے افتادگی سے اندنوں پہروں
نظر آیا جہاں پر سایۂ دیوار بیٹھے ہیں
کہیں ہیں صبر کسکو آہ ننگ و نام کیا شے ہے
غرض رو پیٹ کر ان سب کو ہم اک بار بیٹھے ہیں
نجیبوں کا عجب کچھ حال ہے اس دور میں یارو
جسے پوچھو یہی کہتے ہیں ہم بے کار بیٹھے ہیں
نئی یہ وضع شرمانے کی سیکھی آج ہے تم نے
ہمارے پاس صاحب ورنہ یوں سو بار بیٹھے ہیں
کہاں گردش فلک کی چین دیتی ہے بھلا انشا
غنیمت ہے کہ ہم صورت یہاں دو چار بیٹھے ہیں

ایضاً

مجھے کیوں نہ آئے ساقی نظر آفتاب الٹا
کہ پڑا ہے آج خم میں قدح میں شراب الٹا
عجب الٹے ملک کے ہیں اجی آپ بھی کہ تم سے
کبھی بات کی جو سیدھی تو ملا جواب الٹا
یہ شب گذشتہ دیکھا وہ خفا سے کچھ ہیں گویا
کہیں حق کرے کہ ہووے یہ ہمارا خواب الٹا
یہ عجیب ماجرا ہے کہ بروز عید قرباں
وہی ذبح بھی کرے ہے وہی لے ثواب الٹا
ہو عدو پہ جو جھوٹے تو نہیں ملاتے تیور
اے لو دیکھو کچھ تماشا یہ سنو عتاب الٹا
کھڑے چپ ہو دیکھتے کیا مرے دل اجڑ گئے کو
وہ گنہ تو کہہ دو جس سے یہ ہوا خراب الٹا
غزل اور قافیوں میں نہ کہے تو کیونکہ انشا

کہ ہوا نے خود بخود آ ورق کتاب الٹا

شیخ غلام ہمدانی مصحفی

ولادت امروہہ ۔ وفات لکھنؤ سنہ ۱۲۴۰ھ

دن جوانی کے گئے موسم پیری آیا
آبرو خواب ہے اب وقتِ حقیری آیا

تاب و طاقت رہے کیا خاک کہ اعضا کے تئیں
حاکم ضعف سے فرمان تغیری آیا

سبق نالہ تو بلبل نے پڑھا مجھ سے ولے
نہ اسے قاعدۂ تازہ صفیری آیا

ورد پڑھنے جو اٹھا صبح کو سب سے پہلے
مکتبِ عشق میں ہونے کو وہ میری آیا

پوچھ مت معرکۂ عشق کا ہنگامہ کہ واں
قیس مارا گیا وامق بہ اسیری آیا

اے سلیماں ہو مبارک تجھے یہ تختِ شاہی و
تیرا آصف بھی بہ سامانِ وزیری آیا

چشم کم سے نہ نظر مصحفی خستہ پہ کر
وہ اگر آیا تو مجلس میں نظیری آیا

ایضاً

نہ گیا کوئی عدم کو دلِ شاداں لیکر
یاں سے کیا کیا نہ گئے حسرت و ارماں لیکر

باغ وہ دشتِ جنوں تھا کہ کبھی جس میں سے
لالہ و گل گئے ثابت نہ گریباں لیکر

پردہ خاک میں سو سو رہے جا کر افسوس
پردۂ رخسار پہ کیا کیا مہِ تاباں لیکر

ابر کی طرح سے کر دینگے عالم کو نہال
ہم جدھر جائینگے یہ دیدۂ گریاں لیکر

دوستی تھی مجھے ہر اک سے گئے تا در قبر
دوش پر نعش مری گبر و مسلماں لیکر

رنج پر رنج جو دینے کی ہے خو قاتل کو
ساتھ آیا ہے بہم تیغ و نمکداں لیکر

مصحفیؔ گوشۂ عزلت کو سمجھ تخت شہی
کیا کریگا تو عبث ملکِ سلیماں لیکر

خواجہ حیدر علی آتش

(ولادت دہلی - وفات لکھنؤ ۱۲۶۳ھ)

حُسن پری اک جلوۂ مستانہ ہی اس کا
ہشیار وہی ہے کہ جو دیوانہ ہے اُس کا

گل آتے ہیں ہستی میں عدم سی ہمہ تن گوش
بلبل کا یہ نالہ نہیں افسانہ ہی اُس کا

جو چشم کہ حیران ہوئی آئینہ ہے اُسکی
جو سینہ کہ صد چاک ہوا شانہ ہی اس کا

وہ یاد ہی جا سکی کہ بھلا دے دو جہاں کو
حالت کو کرے غیر وہ یارانہ ہی اُس کا

یوسف نہیں جو ہاتھ لگے چند درم سے
قیمت جو دو عالم کی ہی بیعانہ ہے اُس کا

آوارگی نکہت گل ہے یہ اشارہ
جامے سی جو باہر ہی وہ دیوانہ ہی اسکا

شکرانہ ساقی ازل کرتا ہے آتشؔ
لبریز مے شوق سے پیمانہ ہے اُس کا

ایضاً

سن تو سہی جہاں میں ہی تیرا فسانہ کیا
کہتی ہی تجھکو خلق خدا غائبانہ کیا

زیر زمیں سے آتا ہی جو گل سو زر بکف
قاروں نے راستے میں لٹایا خزانہ کیا

اُڑتا ہی شوق راحتِ منزل سی اسپ عمر
ہمیز کس کو کہتے ہیں اور تازیانہ کیا

چاروں طرف سے صورت جاناں ہو جلوہ گر
دل صاف ہو ترا تو ہے آئینہ خانہ کیا

طبل و علم ہی پاس ہمارے نہ ملک و مال
ہم سے خلاف ہو کے کریگا زمانہ کیا

آتی ہے کس طرح سے مری قبض روح کو
دیکھوں تو موت ڈھونڈھ رہی ہے بہانہ کیا

ہوتا ہے زرد سُن کے جو نامرد مدعی
رستم کی داستان ہے ہمارا فسانہ کیا

یوں مدعی حسد سے نہ دے داد تو نہ دے
آتش غزل یہ تو نے کہی عاشقانہ کیا

حکیم مومن خاں مومن

(ولادت دہلی ۱۲۱۵ھ وفات دہلی ۱۲۶۸ھ)

ناوک انداز جدھر دیدۂ جاناں ہونگے
نیم بسمل کئی ہونگے کئی بے جاں ہونگے

تو کہاں جائیگی کچھ اپنا ٹھکانہ کر لے
ہم تو کل خواب عدم میں شب ہجراں ہونگے

ناصحا دل میں تو اتنا تو سمجھ اپنے کہ ہم
لاکھ ناداں ہوئے کیا تجھ سے بھی ناداں ہونگے

منت حضرت عیسیٰ نہ اٹھائینگے کبھی
زندگی کے لئے شرمندۂ احساں ہونگے

داغ دل نکلیں گے تربت سے مری جوں لالہ
یہ وہ اخگر نہیں جو خاک میں پنہاں ہونگے

پھر بہار آئی وہی دشت نوردی ہوگی
پھر وہی پاؤں وہی خار مغیلاں ہونگے

عمر ساری تو کٹی عشق بتاں میں مومن
آخری وقت میں کیا خاک مسلماں ہونگے

ایضاً

وہ جو ہم میں تم میں قرار تھا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

وہی یعنی وعدہ نباہ کا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
وہ جو لطف مجھ پہ تھا بیشتر وہ کرم کہ تھا مرے حال پر
مجھے یاد ہے وہ ذرا ذرا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
وہ نئے گلے وہ شکایتیں وہ مزے مزے کی حکایتیں
وہ ہر ایک بات پہ روٹھنا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
ہوئے اتفاق سے گر بہم تو وفا جتانے کو دم بدم
گلۂ ملامتِ اقربا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
کوئی بات ایسی اگر ہوئی کہ تمہارے جی کو بری لگی
تو بیاں سے پہلے ہی بھولنا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
کبھی ہم میں تم میں بھی راہ تھی کبھی ہم میں تم میں بھی چاہ تھی
کبھی ہم بھی تم بھی تھے آشنا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
جسے آپ گنتے تھے باخدا جسے آپ کہتے تھے باوفا
میں وہی ہوں مومنِ مبتلا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

مرزا اسد اللہ خاں غالب

(ولادت ۱۷۹۶ء - وفات ۱۸۶۹ء)

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں
یاد تھیں ہم کو بھی رنگا رنگ بزم آرائیاں

لیکن اب نقش و نگار طاق نسیاں ہو گئیں
قید میں یعقوب نے لی گو نہ یوسف کی خبر
لیکن آنکھیں روزنِ دیوار زنداں ہو گئیں
جُوئے خوں آنکھوں سے بہنے دو کہ ہے شامِ فراق
میں یہ سمجھوں گا کہ دو شمعیں فروزاں ہو گئیں
میں چمن میں کیا گیا گویا دبستاں کھل گیا
بلبلیں سن کر مرے نالے غزل خواں ہو گئیں
رنج سے خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج
مشکلیں مجھ پر پڑیں اتنی کہ آساں ہو گئیں
یوں ہی گر روتا رہا غالبؔ تو اے اہل جہاں
دیکھنا ان بستیوں کو تم کہ ویراں ہو گئیں

ایضاً

دل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت درد سے بھر نہ آئے کیوں
روئیں گے ہم ہزار بار کوئی ہمیں رلائے کیوں
دیر نہیں حرم نہیں در نہیں آستاں نہیں
بیٹھے ہیں رہ گذر پہ ہم غیر ہمیں اٹھائے کیوں
قیدِ حیات و بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

ہاں وہ نہیں خدا پرست جاؤ وہ بے وفا سہی
جس کو ہو دین و دل عزیز اسکی گلی میں جائے کیوں
غالبؔ خستہ کے بغیر کون سے کام بند ہیں
روئیے زار زار کیا کیجیئے ہائے ہائے کیوں

ایضاً

ابنِ مریم ہوا کرے کوئی
میرے دکھ کی دوا کرے کوئی

نہ سنو گر بُرا کہے کوئی
نہ کہو گر بُرا کرے کوئی

روک لو گر غلط چلے کوئی
بخش دو گر خطا کرے کوئی

کون ہے جو نہیں ہے حاجتمند
کس کی حاجت روا کرے کوئی

کیا کیا خضر نے سکندر سے
اب کسے رہنما کرے کوئی

جب توقع ہی اُٹھ گئی غالبؔ
کیوں کسی کا گلہ کرے کوئی

شیخ محمدؐ ابراہیم۔ ذوقؔ

ولادت دہلی ۱۲۰۴ھ — وفات دہلی ۱۲۷۱ھ

کسی بیکس کو اے بیداد گر مارا تو کیا مارا
جو آپ ہی مر رہا ہو اسکو گر مارا تو کیا مارا

نہ مارا آپ کو جو خاک ہو اکسیر بن جاتا
اگر پارے کو اے اکسیر گر مارا تو کیا مارا

بڑے موذی کو مارا نفسِ امارہ کو گر مارا
نہنگ و اژدہا و شیر نر مارا تو کیا مارا

تفنگ و تیر تو ظاہر نہ تھا کچھ پاس قاتل کے
الٰہی پھر جو دل پر تاک کر مارا تو کیا مارا

ہنسی کیسا تھہ یاں رونا ہی شل قلقل مینا
کسی نے قہقہہ اے بیخبر مارا تو کیا مارا

جگر دل دونوں پہلو میں ہیں زخمی اسے کیا جانے
ادہر مارا تو کیا مارا ادہر مارا تو کیا مارا

دل سنگین خسرو پر بھی ضرب اے کوہکن پہنچا
اگر تیشہ سر کہسار پر مارا تو کیا مارا

گیا شیطان مارا ایک سجدے کے نہ کرنے میں
اگر لاکھوں برس سجدے میں سر مارا تو کیا مارا

دل بد خواہ میں تھا مارنا یا چشم بد بین میں
فلک پر ذوق تیر آہ گر مارا تو کیا مارا

ایضاً

کیا غرض لاکھ خدائی میں ہوں دولت والے
اُن کا بندہ ہوں جو بندے ہیں محبت والے

گئے جنت میں اگر سوز محبت والے
تو یہ جانو رہے دوزخ میں یہ جنت والے

رہے جوں شیشہ ساعت وہ مکدر دونوں
کبھی مل بھی گئے دو دل جو کدورت والے

حرص کے پھیلتے ہیں پاؤں بقدر وسعت
تنگ ہی رہتے ہیں دنیا میں فراغت والے

ہائے رے حسرت دیدار کہ ہائے کو مری
لکھتے ہیں ہائے دو چشمی سے کتابت والے

نہ ستم کا کبھی شکوہ نہ کرم کی خواہش
دیکھو تو ہم بھی ہیں کیا صبر و قناعت والے

نہیں جز شمع مجاور سر بالین مزار
نہیں جز کثرت پروانہ زیارت والے

کبھی افسوس ہے آتا کبھی رونا آتا
دل بیمار کے دو ہی ہیں عیادت والے

ناز ہے گل کو نزاکت پہ چمن میں اے ذوق
اس نے دیکھے ہی ناز و نزاکت والے

منشی امیر احمد امیر مینائی

ولادت لکھنؤ ۱۲۴۳ھ — وفات حیدرآباد دکن ۱۳۱۸ھ

تیر کھانیکی ہوس ہے تو جگر پیدا کر / سر فروشی کی تمنا ہے تو سر پیدا کر

کوہ کن کوہ کنی شیوۂ عشاق نہیں / ہے جو عاشق دلِ معشوق میں گھر پیدا کر

رنگ چاہے اگر اس باغ میں آزادی کا / نکہتِ گل کیطرح شوقِ سفر پیدا کر

قطرۂ اشک بنے گوہرِ گوشِ جاناں / آبرو اتنی تو اے دیدۂ تر پیدا کر

آخرت میں عمل نیک ہی کام آئیں گے / بیش ہے تجھ کو سفر زادِ سفر پیدا کر

عشق بازی کا اگر حوصلہ رکھتا ہے امیرؔ / دل جو لوہے کا تو پتھر کا جگر پیدا کر

ایضاً

عمر برق و شرار ہے دنیا / کتنی بے اعتبار ہے دنیا

داغ سے کوئی دل نہیں خالی / کیا کوئی لالہ زار ہے دنیا

ہر جگہ جنگ ہر جگہ ہے نزاع / عرصۂ کارزار ہے دنیا

آنے جانے پہ سانس کے ہے مدار / سخت ناپائیدار ہے دنیا

ایک جھونکے میں ہو ادھر سے ادھر / چار دن کی بہار ہے دنیا

کوئی کافر کوئی مسلمان ہے / مجمع نور و نار ہے دنیا

بد تر اسکو سمجھ خزاں سے امیرؔ

دیکھنے کو بہار ہے دنیا

ایضاً

یہ آفتاب ہے گرم اس کی کبریائی کا
کہ ذرہ ذرہ ہے آئینہ خودنمائی کا

پکارتا ہے یہ انداز ناز توبہ شکن
کہ آئے وہ جسے دعویٰ ہو پارسائی کا

حیا تو یہ کہ ہے ستر ہزار پردوں میں
مگر ہے شوق اُسے عالم آشنائی کا

طریق عشق میں گم ہو کے پہنچے منزل پر
نیا یہ راستہ سوجھا ہمیں رسائی کا

خدا خدا جو کرے اور خودی کا دم بھی بھرے
بڑا فریبی ہے جھوٹا ہے وہ خدائی کا

جو بندہ ہے تو مزا بندگی میں پیدا کر
نہیں وہ بندہ جسے ذوق ہو خدائی کا

بشر سے حمد الٰہی امیر کیا ممکن
پہاڑ اٹھائے کہاں حوصلہ یہ رائی کا

نواب مرزا خان داغ

(ولادت دہلی سنہ ۱۲۴۶ھ . وفات حیدرآباد دکن سنہ ۱۳۲۲ھ)

ان آنکھوں نے کیا کیا تماشا نہ دیکھا
حقیقت میں جو دیکھنا تھا نہ دیکھا

تجھے دیکھ کر وہ دوئی اٹھ گئی ہے
کہ اپنا بھی ثانی نہ پایا نہ دیکھا

نہ ہمت نہ قسمت نہ دل ہے نہ آنکھیں
نہ ڈھونڈا نہ پایا نہ سمجھا نہ دیکھا

وہ کب دیکھ سکتا ہے اُس کی تجلی
جس انسان نے اپنا جلوا نہ دیکھا

اُسے دیکھ کر اور کو بھی جو دیکھے
کوئی دیکھنے والا ایسا نہ دیکھا

گیا کارواں چھوڑ کر مجھکو تنہا ذرا میرے آنیکا رستہ نہ دیکھا

تری یاد ہے یا ہے تیرا تصور
کبھی داغ کو ہم نے تنہا نہ دیکھا

ایضاً

سبق ایسا پڑھا دیا تو نے دل سے سب کچھ بھلا دیا تو نے
کچھ تعلق رہا نہ دنیا سے شغل ایسا بتا دیا تو نے
کیا بتاؤں کہ کیا لیا میں نے کیا کہوں میں کہ کیا دیا تو نے
عمر جاوید خضر کو بخشی آبِ حیواں پلا دیا تو نے
نارِ نمرود کو کیا گلزار دوست کو یوں بچا دیا تو نے
کہیں مشتاق سے حجاب ہوا کہیں پردہ اُٹھا دیا تو نے
جس قدر میں نے تجھ سے خواہش کی اس سے مجھکو سوا دیا تو نے
مجھ گنہگار کو جو بخش دیا تو جہنم کو کیا دیا تو نے

داغ کو کون دینے والا تھا
جو دیا اسے خدا دیا تو نے

سیّد اکبر حسین رضوی اکبر الہ آبادی

(ولادت ۱۸۴۶ء الہ آباد وفات ۱۹۲۱ء الہ آباد)

بہار آئی کھلے گل زیب صحن بوستاں ہو کر

عنادِل نے مچائی دھوم سرگرم فغاں ہوکر
بچھا فرش زمرد اہتمام سبزہ تر میں
چلی مستانہ وش باد صبا عنبر فشاں ہوکر
عروجِ نشۂ نشو و نما سے ڈالیاں جھومیں
ترانے گائے مرغانِ چمن نے شادماں ہوکر
بلائیں شاخِ گل کی لیں نسیم صبح گاہی نے
ہوئیں کلیاں شگفتہ روئے رنگینِ بتاں ہوکر
جوانانِ چمن نے اپنا اپنا رنگ دکھلایا
کسی نے یاسمن ہوکر کسی نے ارغواں ہوکر
کیا پھولوں نے شبنم سے وضو صحنِ گلستاں میں
صدائے نغمۂ بلبل اٹھی بانگ اذاں ہوکر
ہوائے شوق میں شاخیں جھکیں خالق کے سجدے کو
ہوئی تسبیح میں مصروف ہر پتی زباں ہوکر
زبانِ برگِ گل نے کی دعا رنگیں عبارت میں
خدا سرسبز رکھے اس چمن کو مہرباں ہوکر
نگاہیں کاملوں کی پڑ ہی جاتی ہیں زمانے میں
کہیں چھپتا ہے اکبرؔ پھول پتوں میں نہاں ہوکر

ایضاً

فلسفی کو بحث کے اندر خدا ملتا نہیں
ڈور کو سلجھا رہا ہے اور سرا ملتا نہیں

معرفت خالق کی عالم میں بہت دشوار ہے
شہرِ تن میں جبکہ خود اپنا پتا ملتا نہیں

کشتیِ دل کی الٰہی بحرِ ہستی میں ہو خیر
ناخدا ملتے ہیں لیکن باخدا ملتا نہیں

پختہ طبعوں پر حوادث کا نہیں ہوتا اثر
کوہساروں میں نشانِ نقشِ پا ملتا نہیں

اہلِ ظاہر جسقدر چاہیں کریں بحث و جدال
میں یہ سمجھا ہوں خودی میں تو خدا ملتا نہیں

بارِ تکلیفوں کا مجھ پر بارِ احساں سے ہے سہل
شکر کی جا ہے اگر حاجت روا ملتا نہیں

فیضِ باطن سے مدد لے عشق کا ہو جام لے
اہلِ ظاہر کے ملائے تو خدا ملتا نہیں

یوں کہو مل آؤں اُن سے لیکن اکبر سچ یہ ہے
دل نہیں ملتا تو ملنے کا مزا ملتا نہیں

ایضاً

نورِ عرفاں عقل کے پردے میں پنہاں ہو گیا
ہوش میں آنا حجابِ روئے جاناں ہو گیا

خوابِ راحت بن گیا خوفِ خدا بعدِ فنا
حشر میں حسنِ عمل گلزارِ رضواں ہو گیا

ترکِ دنیا سے ہوئی جمعیتِ خاطر نصیب
حال میرا گو کہ ظاہر میں پریشاں ہو گیا

صورتِ ظاہر میں دل اک قطرۂ خوں تھا فقط
آ گیا جب جوش میں معنی کا طوفاں ہو گیا

بس یہی دولت مجھے دی تو نے اے عمر دراز
سینہ اک گنجینۂ داغ عزیزاں ہو گیا
اُن کی صورت دیکھ کر آنے لگی یاد خدا
نورِ رخ اُن کا چراغ راہِ عرفان ہو گیا
کی ترقی چشم بد دور ایسی اپنے رنگ میں
اکبرؔ اب مسند نشین بزم رنداں ہو گیا

مولانا محمد علی جوہرؔ

(ولادت رامپور ۱۲۹۵ھ وفات ۱۳۴۹ھ لندن)

ڈر نہیں مجھ کو گناہوں کی گراں باری کا
تیری رحمت ہے سبب میری سبکساری کا
دار نے اک سگِ دنیا کو یہ بخشا ہے عروج
ہے فرشتوں میں بھی چرچا مری دینداری کا
جان بھی چیز ہے کوئی کہ رکھیں تم سے دریغ
پاس اتنا بھی نہ ہو رسمِ وفاداری کا
عشق ہی باعثِ تکوین جہاں ہے غافل
تو نے جانا کہ یہ اک شغل ہے بیکاری کا
عاشقوں کے لئے ہے دار ہی دارو ئے شفا
عشق کی طب میں دوا نام ہے بیماری کا

طفلِ مکتب ہے ترے سامنے یہ چرخِ کہن
کس سے سیکھا ہے یہ اندازِ دل آزاری کا
میری شہرت بھی اگر ہوگی تو کیا؟ قتل بھی کر
نام ہو جائے گا تیری بھی ستمگاری کا
سر فروشی کے لئے ہم تو ہیں آمادہ مگر
حوصلہ بھی تو کسی میں ہو خریداری کا
تو تو ہم سب کو یہیں چھوڑ چلا اے جوہر
شور سنتے تھے بہت تیری وفاداری کا

ایضاً

تشنہ لب ہوں مدتوں سے دیکھئے
کب درِ میخانہ کوثر کھلے
طاقتِ پرواز ہی جب کھو چکے
پھر ہوا کیا گر ہوئے بھی پر کھلے
چاک کر سینے کو پہلو چیر ڈال
یوں ہی کچھ حالِ دلِ مضطر کھلے
رات تلچھٹ تک نہ چھوڑی تب کہیں
رازہائے بادہ و ساغر کھلے
رونمائی کے لئے لایا ہوں جاں
اب تو شاید چہرہ انور کھلے
جیتے جی تو کچھ نہ دکھلایا مگر
مر کے جوہر آپ کے جوہر کھلے

ایضاً

تم یوں ہی سمجھنا کہ فنا میرے لئے ہے
پر غیب سے سامان بقا میرے لئے ہے

پیغام ملا تھا جو حسینؓ ابن علیؓ کو
خوش ہوں وہی پیغام قضا میرے لئے ہے

یہ حور بہشتی کی طرف سے ہے بلاوا
لبیک! کہ مقتل کا صلا میرے لئے ہے

کیوں جان نہ دوں غم میں ترے جبکہ ابھی سے
ماتم یہ زمانے میں بپا میرے لئے ہے

توحید تو یہ ہے کہ خدا حشر میں کہدے
یہ بندہ دو عالم سے خفا میرے لئے ہے

کیوں ایسے نبی پر نہ فدا ہوں کہ جو فرمائے
اچھے تو سبھی کے ہیں برا میرے لئے ہے

جو صحبتِ اغیار میں اس درجہ ہو بیباک
اس شوخ کی یہ حزم و حیا میرے لئے ہے

ہیں یوں تو فدا ابر سیہ پر سبھی میکش
پر آج کی گھنگھور گھٹا میرے لئے ہے

سید فضل الحسن حسرت موہانی

اُس محو تغافل کی جفا میرے لئے ہے
صد شکر کہ اتنا تو روا میرے لئے ہے

دشمن کے مٹانے سے مٹا ہوں نہ مٹونگا
اور یوں تو میں فانی ہوں فنا میرے لئے ہے

اسمیں بھی مجھے شک ہے کہ ظاہر ہی بناوٹ
وہ شوخ جو غیروں سے خفا میرے لئے ہے

وہ حسن کے مالک ہیں جفا بھی انہیں جائز
میں بندۂ خوباں ہوں وفا میرے لئے ہے

پاکر مجھے بیکس تری رحمت یہ پکاری
یہ بندۂ بے برگ و نوا میرے لئے ہے

زاہد کو جو حق ہو بھی تو ہے تجھ پہ جزا کا
البتہ میں خاطی ہوں عطا میرے لئے ہے

دعوت میں تری میں بھی ہوں معلوم ہے لیکن
کیا غیر کی خاطر سے ہی کیا میرے لئے ہے

ارباب ہوس تجھ سے ہیں نالاں تو میں خوش ہوں
جو اُن کو سزا ہے وہ جزا میرے لئے ہے

کہتے ہیں وہ اب قدر ہوئی ہم کو وفا کی
گویا کہ یہ سب مدح و ثنا میرے لئے ہے

اس گیسوئے برہم کی اڑا لائی ہے نکہت — آوارگی باد صبا میرے لئے ہے

اوروں پہ نوازش ہیں جو بیباک ہو حسرت
قسمت سے وہ مجبور حیا میرے لئے ہے

ایضاً

تجھکو پاس وفا ذرا نہ ہوا — ہم سے پھر بھی ترا گلا نہ ہوا
ایسے بگڑے کہ پھر جفا بھی نہ کی — دشمنی کا بھی حق ادا نہ ہوا
جانِ عاشق نثار دوست ہوئی — شادی مرگ کا بہانا نہ ہوا
کٹ گئی احتیاط عشق میں عمر — ہم سے اظہارِ مدعا نہ ہوا
حیف ہے اسکی بادشاہی پر — تیرے کوچے کا جو گدا نہ ہوا
مر گئے ہم تو مٹ گئے سب رنج — یہ بھی اچھا ہوا بُرا نہ ہوا
مل گئی مجھکو صبر عشق کی داد — وہ جو شرمندۂ جفا نہ ہوا

قانع رنج عشق تھا حسرت
عیش دنیا سے آشنا نہ ہوا

ڈاکٹر سر محمد اقبال

کیا کہوں اپنے چمن سے میں جدا کیونکر ہوا
اور اسیر حلقۂ دامِ بلا کیوں کر ہوا
جائے حیرت ہے برا سارے زمانے کا ہوں میں

مجھکو یہ خلعت شرافت کا عطا کیونکر ہوا
کچھ دکھانے دیکھنے کا تھا تقاضا طور پر
کیا خبر ہے تجھکو اے دل فیصلہ کیونکر ہوا
دیکھنے والے یہاں بھی دیکھ لیتے ہیں تجھے
پھر یہ وعدہ حشر کا صبر آزما کیونکر ہوا؟
موت کا نسخہ ابھی باقی ہے اے دردِ فراق
چارہ گر دیوانہ ہے میں لا دوا کیونکر ہوا
پرسشِ اعمال سے مقصد تھا رسوائی مری
ورنہ ظاہر تھا سبھی کچھ کیا ہوا کیوں کر ہوا
میرے مٹنے کا تماشا دیکھنے کی چیز تھی
کیا بتاؤں اُن کا میرا سامنا کیوں کر ہوا

ایضاً

انوکھی وضع ہے سارے زمانے سے نرالے ہیں
یہ عاشق کون سی بستی کے یارب رہنے والے ہیں
علاجِ درد میں بھی درد کی لذت پہ مرتا ہوں
جو تھے چھالوں میں کانٹے نوکِ سوزن سے نکالے ہیں
پھلا پھولا رہے یارب چمن میری امیدوں کا
جگر کا خون دے دے کر یہ بوٹے میں نے پالے ہیں

نہیں بیگانگی اچھی رفیق راہِ منزل سے
ٹھہر جا اے شرر ہم بھی تو آخر مٹنے والے ہیں
مرے اشعار اے اقبال کیوں پیارے نہ ہوں مجھکو
مرے ٹوٹے ہوئے دل کے یہ دردانگیز نالے ہیں

مثنویات

مثنوی اُن اشعار کو کہتے ہیں جن میں دو مصرعے مقفیٰ ہوں
یعنی ہر شعر اپنے دونوں مصرعوں میں جداگانہ قافیہ رکھتا ہو
مثنوی میں اشعار کی تعداد محدود نہیں ہوتی مضمون بھی
مسلسل ہوتا ہے کل نظم ایک ہی بحر میں ہوتی ہے۔

جوشِ عشق

(میر محمد تقی میرؔ)

ضبط کروں میں کبتک آہ
چل اے خامے بسم اللہ

کر ٹک دل کا رازِ نہانی
ثبت جریدہ میری زبانی

یعنی میرؔ اک خستہ غم تھا
سر تا پا اندوہ والم تھا

آنکھ لڑی اسکی اِک جاگہہ — بیخود ہوگئی جانِ آگہہ
صبر نے چاہی دل سو رخصت — تاب نے ڈھونڈی یکدم فرصت
تاب وتوان و شکیب وتحمل — رخصت اُس سے ہوگئے بالکل
سینہ فگاری سامنے آئی — بیتابی نے طاقت پائی
خواب وخورش کچھ کام نہ آیا — ایک گھڑی آرام نہ پایا
سوز سے چھاتی تابہ گویا — اور پلک خونتابہ گویا
دل میں تمنا داغ جگر میں — شیون لب پر یاس نظر میں
نالے شب کو اسکے سُنکر — مرگئے کتنے سر کو دُھن کر
روئے وجبیں پہ خراشِ ناخن — داغوں سے خونکے قامت گلبن
آبلہ دل کا کوئی پھوٹا — فوّارہ لوہو کا چھوٹا
غم نے تو دلمیں کیا ہی چھوڑا — بر میں تھا اِک پکّا پھوڑا
کام رہا ناکامی ہی سے — تسکیں سب بے آرامی ہی سے
دشنۂ غم سے سینہ کوچا — ناخن سے منہ سارا نوچا
دل آماجگۂ غمناکی — اور نفس اِک تیر جفا کی
سنے طاقت نے یارا اسکو — ضعف دلی نے مارا اسکو
رنگ اُڑے چہرے کا ہردم — تھا گویا گل آخرِ موسم
رنگ شکستہ لب کہ فسردہ — کہنے کو زندہ لیکن مردہ
دیدۂ تر کے دریا قائل — ساحل خشک لبی کے سائل
ہردم ہو ہر سمت کو جاری — خونباری سے سیل بہاری

خاک بسر آشفتہ سری کی | شورِ قیامت نوحہ گری سے
آہِ سرد کرے وہ عریاں | بید سا کانپے موے پریشاں
پامالی میں مثلِ جادہ | نقشِ قدم سا خاک افتادہ
اُسکے جو پامال ہوئے سب | خارِ بیاباں لال ہوئے سب
جن نے دیکھا اس کو اک دم | اُن نے کہا یہ بھول کے سب غم
چندے یہ ناشاد رہیگا | پُرمدّت تک یاد رہے گا
ہوش و خرد ناشاد گئے سب | دین و دِل برباد گئے سب
دردِ دل سے کچھ نہ کہے وہ | ہر ایک کا منہ دیکھ رہے وہ
غیر سے بولے نہ یاروں ہی سے | بات کہے تو اشاروں ہی سے
سمجھو تو کوئی داد کو پہنچو! | عاشق کی فریاد کو پہنچو
ورنہ رہے من مار کر اپنا | سر ٹے مارے ہار کر اپنا
کیونکہ غم سے ہو آزادی | جان کے ساتھ اسکی ناشادی
کوئی نہ اس پر سایہ گستر | اپنا ہاتھ اپنے ہی سر پر

کیسا کہئے کیسا کچھ تھا
القصہ وہ ایسا کچھ تھا

بے نظیر کا باغ

میر غلام حسن حسن۔ وفات لکھنؤ ۱۲۰۱ھ

دیا شہ نے ترتیب اک خانہ باغ | ہوا رشک سے جسکے لالہ کو داغ

عمارت کی خوبی درونکی وہ شان — لگے جسمیں زربفت کے سائبان
چھتیں اور پردے بندھے زرنگار — دروں پر کھڑی دست بستہ بہار
کوئی ڈوڈرسے در پہ اٹکا ہوا — کوئی در پہ خوبی سے لٹکا ہوا
وہ مقیش کی ڈوریاں سر بسر — کہ مہ کا بندھا جس میں تارِ نظر
چقوں کا تماشا تھا آنکھونکا جال — نگہ کو وہاں سے گذرنا محال
سنہری مغرق چھتیں ساریاں — وہ دیوار اور در کی گل کاریاں
دیئے ہر طرف آئنے جو لگا — گیا چوگنا لطف اس میں سما
وہ مخمل کا فرش اسکا ستھرا کہ بس — بڑھے جس کے آگے نہ پائے ہوس
رہیں لخلخے اُس میں روشن مدام — معطر شب و روز جس سے مشام
چھپر کھٹ مرصع کا دالان میں — چمکتا تھا اِس طرح ہر آن میں
زمین پر تھی اِسطور اُسکی جھمک — ستاروں کی جیسے فلک پر چمک
زمین کا کروں اسکی کیا میں بیاں — کہ صندل کا اک پارچہ تھا عیاں
بنی سنگ مرمر کی چوپڑ کی نہر — گئی چار سو اُس کے پانی کی لہر
قرینے سے گرد اُس کے سرو سہی — کچھ اک دُور دُور اس سے سیب و بہی
کہوں کیا میں کیفیت دار بست — لگاتے رہیں تاک واں مے پرست
ہوائے بہاری سے گل لہلہے — چمن سارے شاداب اور تھے ہرے
زمرد کے مانند سبزے کا رنگ — روش پر جواہر لگا جیسے سنگ
روش کی صفائی پہ بے اختیار — گل اشرفی نے کیا زر نثار
چمن سے بھرا باغ گل سے چمن — کہیں نرگس و گل کہیں یاسمن

چنبیلی کہیں اور کہیں موتیا
کہیں رائے بیل اور کہیں موگرا

کھڑے شاخ شبو کے ہر جا نشان
مدن بان کی اور ہی آن بان

کہیں ارغواں اور کہیں لالہ زار
جُدی اپنے موسم میں سب کی بہار

کہیں جعفری اور گیندا کہیں
سماں شب کو داؤدیوں کا کہیں

عجب چاندنی میں گلوں کی بہار
ہر اک گل سفیدی سے مہتاب وار

کھڑے سرو کیطرح چنپا کے جھاڑ
کہے تو کہ خوشبوئیوں کے پہاڑ

کہیں زرد نسرین کہیں نسترن
عجب رنگ کے زعفرانی چمن

پڑا آب جو ہر طرف کو بہے
کریں قمریاں سرو پر چہچہے

گلوں کا لب نہر پہ جھومنا
اسی اپنے عالم میں منہ چومنا

وہ جُھک جُھک کے کرنا خیابان پہ
نشے کا سا عالم گلستان پر

خراماں صبا صحن میں چار سُو
دماغوں کو دیتی ہر اک گل کی بو

کھڑے نہر پر قاز اور قرقرے
لئے ساتھ مرغابیوں کے پرے

صدا قرقروں کی بطوں کا وہ شور
درختوں پہ بگلے منڈیروں پہ مور

چمن آتشِ گل سے دہکا ہوا
ہوا کے سبب باغ مہکا ہوا

صبا جو گئی ڈھیریاں کرکے بھول
پڑے ہر طرف مولسریونکے پھول

وہ کیلوں کی اور مولسریونکی چھاؤں
لگی جائیں آنکھیں لئے جسکا ناؤں

خوشی سے گلوں پر سدا بلبلیں
تعشق کی آپس میں باتیں کریں

بے نظیر کی سواری

نکل گھر سے جس دم ہوا وہ سوار ۔۔۔ کئے خوان گوہر کے اس پر نثار

زبس تھا سواری کا باہر ہجوم ۔۔۔ ہوا جب کہ ڈنکا پڑی سب میں دھوم

برابر برابر کھڑے تھے سوار ۔۔۔ ہزاروں ہی تھی ہاتھیوں کی قطار

سنہری روپہلی وہ عماریاں ۔۔۔ شب و روز کی سی طرح واریاں

چمکتے ہوئے بادلے کے نشان ۔۔۔ سواروں کے غٹ اور بانوں کی شان

ہزاروں ہی اطراف میں پالکی ۔۔۔ جھلابور کی جگمگی نالکی

کہاروں کی زربفت کی کرتیاں ۔۔۔ اور اُن کے دبے پاؤں کی پھرتیاں

بندھی پگڑیاں تاش کی سر اوپر ۔۔۔ چکاچوندیں جس سے آوے نظر

وہ ہاتھوں میں سونے کے موٹے کڑے ۔۔۔ جھلک جس کی ہر ہر قدم پر پڑے

وہ ماہی مراتب وہ سرو رواں ۔۔۔ وہ نوبت کا دولہا کی جیسے سماں

وہ شہنائیوں کی صدا خوشنما ۔۔۔ سہانی وہ نوبت کی آوے صدا

وہ آہستہ گھوڑوں پہ نقارچی ۔۔۔ قدم با قدم بالباس زری

بجاتے ہوئے شادیانے تمام ۔۔۔ چلے آگے آگے ملے شادکام

سوار اور پیادے صغیر و کبیر ۔۔۔ جلو میں تمامی امیر و وزیر

وہ نذریں کہ جس جس نے تھی ٹھانیاں ۔۔۔ شہ و شاہزادے کو گذرانیاں

ہوئے حکم سے شاہ کے پھر سوار ۔۔۔ چلے سب قرینے سے باندھے قطار

سجے اور سجائے سبھی خاص و عام ۔۔۔ لباس زری میں ملبّس تمام

مرصّع کے سازوں سے کوتل سمند
کہ خوبی میں روح القدس سے دوچند

وہ فیلوں کی اور میگڈمبر کی شان
جھلکتے وہ مقیش کے سائبان

چلے پایۂ تخت کے ہو قریب
بدستورِ شاہانہ پنہتی جریب

سواری کے آگے بپئے اہتمام
لئے سونے روپے کے عاصے تمام

نقیب اور جلودار اور چوبدار
یہ آپس میں کہتے تھے ہر دم پکار

اُسی اپنے معمول و دستور سے
ادب سے تفاوت سے اور دور سے

بلو! نوجوانو! بڑھے جائیو
دو جانب سے باگیں لئے جائیو

بڑھے جائیں آگے سے چلتے قدم
بڑھے عمر و دولت قدم با قدم

غرض اس طرح سے سواری چلی
کہے تو کہ بادِ بہاری چلی

تماشائیوں کا جدا تھا ہجوم
کہ ہر طرف تھی لاکھ عالم کی دھوم

لگا قلعے سے شہر کی حد تلک
وہ کالوں پہ تھی بادلے کی جھلک

منڈھے تھے تمامی سے دیوار و در
تمامی تھا وہ شہر سونے کا گھر

کیا تھا زبس شہر آئینہ بند
ہوا چوک کا لطف واں چار چند

رعیت کی کثرت ہجوم سپاہ
گذرتی تھی رک رک کے ہر جا نگاہ

ہوئے جمع کوٹھوں پہ جوں مرد و زن
ہر اک سطح تھا جوں زمینِ چمن

لگا لنج سے تا ضعیف و نحیف
تماشے کو نکلے وضیع و شریف

وحوش و طیوروں تلک بے محل
پڑے آشیانوں سے اپنے نکل

نہ پہنچا جو اک مرغ قبلہ نما
سو وہ آشیانے میں تڑپا کیا

شادی کی تیاری

ہوئیں ہر طرف سب دل آزاریاں — لگیں ہونے شادی کی تیاریاں
بڑی خواہشوں سے جب آیا وہ روز — چڑھا بیاہنے وہ مہ شب فروز
محل سے نکل جب ہوا وہ سوار — بجے شادیانے بہم ایک بار
کروں اس تجمل کو کیونکر عیاں — کہ باہر ہے تقریر سے یہ بیاں
وہ دولہا کے اٹھتے ہی اک غل پڑا — لگا دیکھنے اُٹھ کے چھوٹا بڑا
کوئی دوڑ گھوڑوں کو لانے لگا — کوئی ہاتھیوں کو بٹھانے لگا
لگا کوئی کہنے ادھر آئیو — ارے رتھ شتابی مری لائیو
کسی نے کسیکو پکارا کہیں — نہ لانے پہ میانے کے مارا کہیں
کوئی پالکی میں چلا ہو سوار — پیادوں کی رتھ اپنے آگے قطار
جو کثرت میں دیکھا کہ گاڑی نہیں — کوئی مانگے تانگے پہ بیٹھا کہیں
سپر اور قبضے کھڑکنے لگے — سواروں کے گھوڑے بھڑکنے لگے
ٹکورے وہ نوبت کے اور اُنکے بعد — گرجنا وہ دھونسوں کا مانند رعد
وہ شہنائیوں کی سہانی دھنیں — جنہیں گوشِ زہرہ مفصل سنیں
ہزاروں تمامی کے تختِ رواں — وہ اہل نشاط ان پہ جلوہ کناں
وہ طبلوں کا بجنا اور انکی صدا — یہ گانا کہ اچھا بنا لاڈلا
وہ نوشہ کا گھوڑے پہ ہونا سوار — وہ موتی کا سہرا جواہر نگار
ٹھٹھک کر وہ گھوڑے کا چلنا سنبھل — ہما سے وہ دونوں طرف مورچھل

دو رستہ جو روشن چراغاں ہوئے
پتنگے خوشی سے غزل خواں ہوئے

چراغوں کے تر پولئے جابجا
اور اُن میں وہ بازاریوں کی صدا

کوئی پان بیچے کھلونے کوئی
کوئی دال موٹھ اور سلونے کوئی

تماشائیوں کا جدا اِک ہجوم
پتنگے گریں جوں چراغاں پہ جھوم

براتی ادھر اور اُدھر جوق جوق
وہ آواز قرنا وہ آواز بوق

وہ ابرک کی ٹٹی وہ مینے کے جھاڑ
کہے تو کہ تنکے کی اوجہل پہاڑ

اناروں کا دغنا ہوائی کا زور
ستاروں کا چھٹنا پٹاخوں کا شور

وہ مہتاب کا چھوٹنا بار بار
ہر اک رنگ کی جس سے دونی بہار

دھواں چھپ گیا نور میں نور ہو
سیاہی اُڑی شب کی کافور ہو

زری پوش سروار سب یک دگر
پھریں برق کی طرح ایدہر اُودھر

کہے تو کہ نزدیک اور دور سے
زمین و زماں بھر گیا نور سے

از مثنوی میر حسن

بکاؤلی کا اضطراب

پنڈت دیاشنکر نسیم لکھنوی

(ولادت لکھنؤ۔ وفات لکھنؤ ۱۸۶۰ء)

گلچیں نے وہ پھول جب اڑایا
اور غنچۂ صبح کھلکھلایا

وہ سبزۂ باغ خواب آرام
یعنی وہ بکاولی خوش اندام

جاگی مرغ سحر کے غل سے
اٹھی نکہت سی فرش گل سے

منہ دھونے جو آنکھ ملتی آئی — پُر آب وہ چشم حوض پائی
دیکھا تو وہ گل ہَوا ہُوا ہے — کچھ اور ہی گُل کھلا ہوا ہے
گھبرائی کہ ہیں کدھر گیا گل — جھنجھلائی کہ کون دے گیا جُل
ہے ہے مرا پھول لیگیا کون — ہے ہے مجھے خار دے گیا کون
ہاتھ اُسپہ اگر پڑا نہیں ہے — بو ہو کے تو پھول اڑا نہیں ہے
اپنوں میں سے پھول لیگیا کون — بیگانہ ہے سبزہ کے سوا کون
شبنم کے سوا چرانے والا — اوپر کا تھا کون آنے والا
جس کف میں وہ گل ہو داغ ہو جائے — جس گھر میں ہو گل چراغ ہو جائے
آنکھوں سے عزیز گل مرا تھا — پتلی وہی چشمِ حوض کا تھا
گلچیں کا جو ہائے ہاتھ ٹوٹا — غنچے کے بھی منہ سے کچھ نہ پھوٹا
او خار پڑا نہ تیرا چنگل — مشکیں کس لیں نہ تو نے سنبل
او باد صبا ہوا نہ بتلا — خوشبو ہی سنگھا پتہ نہ بتلا
بلبل تو چہک اگر خبر ہے — گل تو ہی مہک سنگھا کدھر ہے
لرزاں تھی زبس یہ دیکھ کہرام — تھی سبزہ سی راست مو براندام
جو نخل تھا سوچ میں کھڑا تھا — جو برگ تھا ہاتھ مل رہا تھا
رنگ اُس کا غرض لگا بدلنے — گل برگ سے کف لگی وہ ملنے
گل کا سا لہو بھرا گریبان — سبزہ کا سا تار تار داماں
دکھلا کے کہا سمن پری کو — اب چین کہاں بکاولی کو
تھی بسکہ غبار سے بھری وہ — آندھی سی اُٹھی ہوا ہوئی وہ

ہر باغ میں پھولتی پھری وہ جس تختہ میں مثلِ باد جاتی		ہر شاخ پہ جھولتی پھری وہ اِس رنگ کے گل کی بو نہ پاتی
	بے وقت کسیکو کچھ مِلا ہے پتا کہیں حکم بِن ہِلا ہے	مثنوی گلزارِ نسیم

سرائے فانی

حکیم تصدّق حسین عرف نوّاب مرزا شوقؔ

(ولادت لکھنؤ۔ وفات لکھنؤ ۱۸۷۱ء)

جائے عبرت سرائے فانی ہے
مورِدِ مرگِ نوجوانی ہے

اونچے اونچے مکان تھے جن کے
آج وہ تنگ گور میں ہیں پڑے

کل جہاں پر شگوفہ و گل تھے
آج دیکھا تو خار بالکل تھے

جس چمن میں تھا بلبلوں کا ہجوم
آج اُس جا ہے آشیانۂ بوم

بات کل کی ہے نوجوان تھے جو
صاحبِ نوبت و نشان تھے جو

آج خود ہیں نہ ہے مکاں باقی
نام کو بھی نہیں نشاں باقی

غیرتِ حور مہ جبیں نہ رہے
ہیں مکان گر تو وہ مکیں نہ رہے

جو کہ تھے بادشاہ ہفت اقلیم
ہوئے جا جا کے زیرِ خاک مقیم

کوئی لیتا بھی اب نہیں یہ نام
کونسی گور میں گیا بہرام

اب نہ رستم نہ سام باقی ہے
اِک فقط نام ہی نام باقی ہے

کل جو رکھتے تھے اپنے فرق پہ تاج
آج ہیں فاتحہ کو وہ محتاج

تھے جو خود سر جہان میں مشہور
عطر مٹی کا جو نہ ملتے تھے
گردش چرخ سے ہلاک ہوئے
تھے جو مشہور قیصر و فغفور!
تاج میں جنکے ٹکتے تھے گوہر
رشک یوسف جو تھے جہانمیں حسین
ہر گھڑی منقلب زمانہ ہے
ہے نہ شیریں نہ کوہکن کا پتہ
بوئے الفت تمام پھیلی ہے
صبح کو طائرانِ خوش الحان

مل گیا خاک میں سب انکا غرور
نہ کبھی دھوپ میں نکلتے تھے
استخواں تک بھی انکے خاک ہوئے
باقی ان کا نہیں نشان قبور
ٹھوکریں کھاتے ہیں وہ کاسہ سر
کھا گئے اُن کو آسمان و زمیں
یہی دنیا کا کارخانہ ہے
نہ کسی جا ہے نل دمن کا پتہ
باقی اب قیس ہے نہ لیلی ہے
پڑھتے ہیں کُلُّ مَنْ عَلَیْھَا فَانٍ[1]

موت سے کسکو رستگاری ہے
آج وہ کل ہماری باری ہے

خسرو امن کا دربار

مولوی محمد حسین۔ آزاد

(ولادت دہلی ۱۸۳۱ء وفات لاہور ۱۹۱۰ء)

میں کہ آشوب جہاں سے تہا ستم دیدہ بہت
شوق دل لیکے غرض قصر میں آیا مجھکو

اُن کو سمجھا غنیمت دلِ غم دیدہ بہت
پر عجب عالمِ نیرنگ دکھایا مجھکو

[1] سب آدمیوں کے لئے فنا ہے۔

خسرو امن تھا واں جلوہ فزائے دربار
دیتی فرحت تھی دل و جاں کو ہوائے دربار

اسکے آگے تھا مرادوں کا چمن پھول رہا
آپ تھا پھولوں کے جھولے میں پڑا جھول رہا

نیند کا جھونکا تھا جھولے کو جھلاتا جاتا
مورچھل سر پہ تھا آرام ہلاتا جاتا

گل خورشید تھا واں ہر گل شاداب سدا
دھوپ کی جا تھی مگر چادر مہتاب سدا

صبح دن رات کھڑی سامنے ہنستی تھی وہاں
نور کے ساتھ سدا اوس برستی تھی وہاں

ہاتھ باندھے تھیں مرادیں وہاں ہر دم آگے
آرزوئیں تھیں کھڑی ناچتی چھم چھم آگے

دولت و عیش و طرب تھے امرائے دربار
کرتے تھے نظم و نسق جملہ برائے دربار

دل میں افکار پریشاں کا نہ تھا نام وہاں
ہاتھ جمعیت خاطر سے تھے سب کام وہاں

مرغزاروں میں جو اشجار تھے سب چھائے ہوئے
دامن امن و اماں خلق پہ پھیلائے ہوئے

شغل میں اپنے ہر اک شخص تھا مشغول وہاں
چنتا تھا راحت و آرام کے پھل پھول وہاں

علم امن کا شکریہ ادا کرتا ہے

دفعتہ دیکھا کہ اک پیر کہن سال آئے
پر عجب شان ہے وہ مرد خوش اعمال آئے

جسم پر نور میں پہنے ہوئے جامہ کالا
بر میں جبہ عربی سر پہ عمامہ کالا

پاؤں تک شملہ دستار جو آجاتا تھا
انکی مقدار فضیلت کو بتا جاتا تھا

لاغری چہرہ پہ ہر چند کہ چھائی تھی بہت
رخ پہ عینک نے مگر شان بڑھائی تھی بہت

شانہ تھا ریش مقدس میں کیا پیری نے
اور جھکایا تھا بڑھاپے کی زمیں گیری نے

ساتھ کچھ لوگ کتابیں تھے اٹھائے آئے
اور بغل میں کئی جزدان دبائے آئے

سب کے سب پیچھے بصد صدق و صفا آتے تھے
ٹیکتے آپ کرامت کا عصا آتے تھے

الغرض بادشۂ امن کے آگے آئے — پہلے سب سے بہ ادب دست دعا پھیلائے
پھر یہ کی عرض کہ آئے ہیں وکالت کیلئے — علم نے بھیجا ہے تقدیم رسالت کیلئے
اہل تصنیف ہیں تصنیف میں مصروف سدا — ہے ہر اک شہرت تعریف میں مصروف سدا
اہل تحصیل کو پڑھنے کے سوا کام نہیں — اور جہاں میں انہیں فکر سحر و شام نہیں
دم بدم علم ہے کرتا عمل ایجاد نئے — آتے ہیں کارگہ دہر میں استاد نئے
درس و تدریس کے چرچے جو ہیں گھر گھر جاری — ہیں یہ جمعیت خاطر کی باتیں ساری
جو ہمیں چاہئیں موجود ہیں سارے ساماں — ملتے ہیں پہلے ضرورت سے ہمارے ساماں
اے شہ امن یہ سب فیض و کرم تیرے ہیں — کشور علم میں سب بھر رہے دم تیرے ہیں
تو نہ ہووے تو ابھی خلق میں طوفاں ہو جائے — سب کا شیرازہ اوراق پریشاں ہو جائے

زراعت شکریہ ادا کرتی ہے

تھا انہوں نے ابھی دفتر نہ سمیٹا اپنا — اور نہ تھا علم نے طومار لپیٹا اپنا
دیکھا انبوہ ہے ایک سے زیادہ آتا — ہے سوار ان میں کوئی کوئی پیادہ آتا
گھوڑیاں آگے سواری میں بچھیرے پیچھے — اور کئی بیل لئے آتے ہیں گھیرے پیچھے
گود میں ہے کوئی گوسالہ اٹھائے آتا — کوئی ہل اپنا بغل میں ہے دبائے آتا
نذر کے ٹوکرے کندھوں پہ دھرے آتے ہیں — نئی فصلوں کے اناج ان میں بھرے لاتے ہیں
طرے اعزاز کے جن لوگوں نے ہیں پائے ہوئے — بالی گیہوں کی وہ پگڑی میں ہیں لٹکائے ہوئے
ہمت و عزم میں بوڑھے بھی جواں ہیں انکے — تندرستی کے نشاں منہ پہ عیاں ہیں انکے
دیکھ انہیں سب علماہٹ کے کنارے آئے — بے تکلف سر دربار وہ سارے آئے

اور کہا سب نے کہ اے بادشہ امن و اماں
تجھ سے جاری ہے زمانہ میں نئی امن و اماں

کرکے طے گھر سے بہت فرسخ و میل آئے ہیں
جانب اہل زراعت سے وکیل آئے ہیں

کہ وہ صحرا میں جو بیٹھے ہیں سہارے تیرے
آسرا رکھتے ہیں دن رات بچارے تیرے

کھیت پر بیٹھے ہوئے ہیں تو دعا کرتے ہیں
گھر میں ہیں تو ترے شکرانے ادا کرتے ہیں

تو وہ نیساں ہے کہ جس کھیت پہ آ جاتا ہے
خاک پر آب زمرد کو بہا جاتا ہے

کشتِ امید زمانہ کی ہری ہے تجھ سے
سبز کھیتوں کی سدا گود بھری ہے تجھ سے

پیر دہقاں کہ جو ہے سایہ میں تیرے بیٹھا
جان و مال اپنا ہے مٹی میں بکھیرے بیٹھا

سایۂ امن ترا اسکو ہرا رکھتا ہے
صرصرِ فتنہ سے محفوظ سدا رکھتا ہے

تو بچاتا ہے زمانہ کی لکد کوبی سے
ترکتازانِ حوادث کی پُرآشوبی سے

فیض رحمت ترا ہر لحظہ بڑھاتا ہے اسے
زور تیرا ہے کہ زر کرکے اٹھاتا ہے اسے

کرتا خرمن ہے تو ہی بکھرے ہوئے دانوں کو
تو ہی اک دانہ سے ہے پالتا سو جانوں کو

تو نہو وے تو ہرے کھیت ہوں پامال تمام
دم میں ہو خلق خدا کال سے بدحال تمام

تجارت شکریہ ادا کرتی ہے

سخن انکا نہ سرِ خاتمہ آیا تھا ابھی
اور زراعت نے یہ خرمن نہ اٹھایا تھا ابھی

لوگ کچھ اور بھی آئے پئے تقریر وہاں
دشت و دریا کی لگے کھینچنے تصویر وہاں

گرچہ حال اپنا زباں سے نہ بتاتے تھے وہ سب
مگر انداز سے ایسے نظر آتے تھے وہ سب

کہ ابھی قطع کئے راہِ سفر آئے ہیں
ریل سے یا کہ جہازوں سے اُتر آئے ہیں

تھا کوئی دوش پہ خورجین اٹھائے آتا
اور بغل میں کوئی بیگ اپنا دبائے آتا

رنگ سنولائے ہوئے چہرے تھے گرد آلودہ
دل تھے کلفت زدہ اور سینے تھے درد آلودہ

دشت و دریا کے عجائب تھے وہ ہمراہ لائے
تحفے ہر ملک کے ہمراہ پئے شاہ لئے

اے شہ ہند دعا خلق خدا کرتی ہے
اور تجارت ترا شکرانہ ادا کرتی ہے

کہ ترے نظم و نسق سے جو ہیں رستے جاری
شرق سے غرب ہیں جنسیں ہیں پہنچتی ساری

ہم اٹھا لیتے ہیں نفع درم و دام اُن سے
اور جو گھر بیٹھے ہیں پاتے ہیں وہ آرام ان سے

کاروانوں کے شب و روز ہیں جو تار لگے
کوہ و صحرا میں جہاں دیکھو ہیں بازار لگے

رہے جس جا پہ مسافر کیلئے گھر ہے وہیں
شیر کنجشک جو جا ہو تو میسر ہے وہیں

نہیں اصلا خطر رہزنی و ہرا انہیں
ہے ترے فیض سے ہر دشت و جبل شہر انہیں

کوئی دم لیتا ہے رستہ میں کوئی سوتا ہے
پر کہیں کیل کا کھٹکا بھی نہیں ہوتا ہے

اے شہ ہند اگر لطف ترا عام نہ ہو
اور ترے نظم پہ عالم کا سر انجام نہ ہو

ابھی بازار جہاں زیر و زبر ہو جائے
خانۂ امن و اماں موت کا گھر ہو جائے

صنعت و دستکاری

تھی نہ بات انکی ابھی ختم پہ آنے پائی
اور تجارت یہ کہاں تھی نہ بڑھانے پائی

لوگ کچھ سامنے سے اور نمودار ہوئے
لیکن اس رنگ سے وہ داخل دربار ہوئے

جیسے تختہ ہو گل بوقلموں کا آتا
یا چمن ہو کوئی نیرنگ و فسوں کا آتا

خاک پر تھے گل ایجاد لگاتے آتے
پھول جھڑتے تھے جو تھے ہاتھ ہلاتے آتے

دستکاری نے کیا لعبت چین تھا انکو
رنگ چمکا کے کیا نقش نگیں تھا انکو

چشم صنعت سے جو تھے کام بنائے اکثر
ضعف بینائی سے عینک تھے لگائے اکثر

تھے لئے نذر نہ کچھ گوہر و زر ہاتھوں میں
دست صنعت کے تھے گلدستۂ تر آنکھوں میں

غرض آ کر سر تسلیم جھکاتے سب نے
پیشکش لیکے جو آئے تھے دکھائے سب نے

کر چکے شاہ کا جب در حق نذرانہ ادا
تب کیا جانب صنعت سے یہ شکرانہ ادا

اے شہ امن ہمیشہ ہو یہ دربار کھلا
کہ اسی سایہ میں اپنا بھی ہو بازار کھلا

دستکاری کے عمل تجھ سے ہیں سارے چلتے
کام سب تیری بدولت ہیں ہمارے چلتے

تار ہو غیب کے اخبار سنائے جاتا
ریل کا تخت سلیماں ہو اڑائے جانا

کارخانے جو بڑے چلتے ہیں دن رات یہاں
اور کلیں کر رہی ہیں جو جو طلسمات یہاں

اے شہ امن یہ تیری برکت ہے ساری
تیرے زوروں کی کلوں میں حرکت ہے ساری

دولت شکریہ ادا کرتی ہے

سلسلہ صنع و صناعت کا ابھی تھا جاری
زر تقریر پہ تھے کر رہے مینا کاری

دفعتہً چاندنی دربار پہ چھائی یکسر
ہو گئے سب در و دیوار طلائی یکسر

جیسے جھڑتے سر گلبن سے ہیں گلزار میں پھول
چاندی سونے کے برسنے لگے دربار میں پھول

کہ پری اتنے میں اک دوش ہوا پر آئی
آئی لیکن عجب انداز و ادا سے آئی

حسن رفتار سے ہو صورت سیماب اڑتی
جائے دامن تھی فقط چادر مہتاب اڑتی

حسن تھا گرچہ حقیقت میں ہوائی اسکا
اور سراپا تن نازک تھا طلائی اسکا

ٹھوکروں میں تھی زر و سیم اڑاتی چلتی
باغ نرگس سا دم رفتار کھلاتی چلتی

تھی نہ تھمتی روش گردش ایام اک جا
یعنی شوخی اسے دیتی نہ تھی آرام اک جا

جب کہ وہ غیرت نو سحری آ پہنچی
پڑ گئی دھوم کہ دولت کی پری آ پہنچی

سامنے بادشہ امن کے جس دم آئی
کہ جہاں تیری بدولت ہے ہر اک حال میں خوش
گھر مہاجن کا جو لاکھوں سے ہے معمور سدا
زیر دستوں کی ترے سایۂ میں خوش ہستی ہے
ایک کا ایک پہ چل سکتا نہیں زور ذرا
بند دستوں کو ضرر کچھ نہیں نقصانوں سے

حُسنِ شکرانہ میں یہ نغمۂ دلکش گائی
ہے کوئی حال میں خوش اور کوئی کھا لیں خوش
خوش ہے دو پیشہ کی مزدوری میں مزدور سدا
اپنا سر پیٹتی ہاتھوں سے زبردستی ہے
مار کیا تاب جو بل مارے سر مور ذرا
ہاتھ ہیں دستِ درازی کے جدا شلوں سے

ہے ترے نظم و نسق سے جو نظامِ عالم
شربتِ عیش سے معمور ہے جامِ عالم
(نظم آزاد)

قطعات

قطعہ کے لغوی معنی ٹکڑے کے ہیں۔ شاعری کی اصطلاح میں قطعہ چند ابیات کا مجموعہ ہے جس میں ایک بیت کا مطلب دوسرے بیت سے متعلق ہو اور سب سے پہلی بیت مقفیٰ نہ ہو لیکن بنائے قافیہ بیت اوّل کے مصرعۂ ثانی پر ہو۔ قطعہ میں مطلع نہیں ہوتا۔ لیکن بعض شعرا نے اس کی پابندی نہیں کی۔ مضمون مسلسل ہوتا ہے۔

میر محمد تقی میر

بے زری کا نہ کر گلہ غافل / رہ تسلی کہ یوں مقدر تھا

اتنے منعم جہان میں گذرے / وقت رحلت کسی کنے زر تھا

صاحب جاہ و شوکت و اقبال / یک از انجملہ اب سکندر تھا

تھی یہ سب کائنات زیرنگیں / ساتھ مور و ملخ سا لشکر تھا

لعل و یاقوت ہم زر و گوہر / چاہیے جسقدر میسر تھا

آخرِ کار جب جہاں سے گیا / ہاتھ خالی کفن سے باہر تھا

عیب طولِ کلام مت کر یو / کیا کروں میں سخن سے خوگر تھا

خوش رہا جب تلک رہا جیتا

میر معلوم ہے قلندر تھا

گو توجہ سے زمانے کی جہاں میں مجکو / جاہ و ثروت کا میسر سر و ساماں ہوا

شکر صد شکر کہ میں ذلت و خواری کے سبب / کسی عنوان میں ہم چشم عزیزاں نہ ہوا

آئی نظر جو گورِ سلیماں کی ایک روز

لوحے یہ اُس مزار کے تھا یہ رقم ہوا

کاے سرکشاں جہان میں کھینچا تھا میں بھی سر

پایان کار مور کی خاک قدم ہوا

کیا کیا عزیز دوست ملے میر خاک میں
نادان یاں کسُو کو کسُو کا بھی غم ہوا

حکیم مومن خاں مومن

قطعہ تاریخ وفات مولوی شاہ عبدالعزیز صاحب

انتخاب نسخہ دیں مولوی عبدالعزیز
جانب ملکِ عدم تشریف فرما کیوں ہوے
ہے ستم اے چرخ تو کسکو یہاں سے لیگیا
جب اٹھائی نعش اِک عالم تہ و بالا ہوا
کیا کس و ناکس پہ تھا صدمہ کیا جو وقت دفن
مجلسِ دردآفریں تعزیت ہیں ہیں بھی تہا

بعدیل و بنظیر و بمیثال و بمثل
آگیا تھا کیا کہیں مردوں کے ایمانیں خلل
کیا کیا یہ ظلم تونے بیکسوں پر ائے اجل
لوٹتا تھا خاک پہ ہر قدسیِ گردوں محل
ڈالتا تھا خاک سر پر ہر عزیز و مبتذل
جب پڑھی تاریخ مومن نے یہ آکر بے بدل

دستِ بیدادِ اجل سے بے سر و پا ہوگئے
فقر و دیں فضل و ہنر لطف و کرم علم و عمل

۱۲ ھ ۳۹
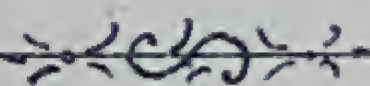
ے نوٹ آخری مصرعہ ہیں ہر لفظ کا پہلا اور آخری لفظ کاٹ دو اور باقی حروف کے اعداد بہ قاعدہ جمل جمع کرو تاریخ نکل آئیگی۔

مرزا اسد اللہ خاں غالب

گذارش بحضورِ شاہ

اے شہنشاہ آسماں اورنگ
اے جہاندارِ آفتاب آثار

تھا میں اک بینوائے گوشہ نشیں
تھا میں اک دردمند سینہ فگار

تم نے مجھکو جو آبرو بخشی
ہوئی میری وہ گرمیٔ بازار

کہ ہوا مجھ سا ذرۂ ناچیز
روشناس ثوابت و سیّار

گرچہ از روئے ننگ بے ہنری
ہوں خود اپنی نظر میں اتنا خوار

کہ گر اپنے کو میں کہوں خاکی
جانتا ہوں کہ آئے خاک کو عار

شاد ہوں لیکن اپنے جی میں کہ ہوں
بادشہ کا غلام کارگزار

خانہ زاد اور مرید اور مداح
تھا ہمیشہ سے یہ عریضہ نگار

بارے نوکر بھی ہو گیا صد شکر
نسبتیں ہو گئیں مشخص چار

نہ کہوں آپ سے تو کس سے کہوں
مدعائے ضروری الاظہار

پیر و مرشد اگرچہ مجھکو نہیں
ذوق آرائش سر و دستار

کچھ تو جاڑے میں چاہیئے آخر
تا نہ دے بادِ زمہریر آزار

کیوں نہ درکار ہو مجھے پوشش
جسم رکھتا ہوں ہے اگرچہ نزار

کچھ خریدا نہیں ہے اب کے سال
کچھ بنایا نہیں ہے اب کی بار

رات کو آگ اور دن کو دھوپ
بھاڑ میں جائیں ایسے لیل و نہار

آگ تاپے کہاں تلک انسان
دھوپ کھاوے کہاں تلک جاندار

دھوپ کی تابش آگ کی گرمی
وَقِنَا رَبَّنَا عَذَابَ النَّار[ع]

میری تنخواہ جو مقرر ہے
اسکے ملنے کا ہے عجب ہنجار

رسم ہے مردہ کی چھ ماہی ایک
خلق کا ہے اسی چلن پہ مدار

مجھ کو دیکھو تو ہوں بقیدِ حیات
اور چھ ماہی ہو سال میں دو بار

بسکہ لیتا ہوں ہر مہینے قرض
اور رہتی ہے سود کی تکرار

میری تنخواہ میں تہائی کا
ہو گیا ہے شریک ساہوکار

آج مجھ سا نہیں زمانے میں
شاعرِ نغز گوے خوش گفتار

رزم کی داستاں اگر سنئے
ہے زباں میری تیغ جوہر دار

بزم کا التزام گر کیجے
ہے قلم میرا ابر گوہر بار

ظلم ہے گر نہ دو سخن کی داد
قہر ہے گر کرو نہ مجھ کو پیار

آپ کا بندہ اور پھروں ننگا
آپ کا نوکر اور کھاؤں اُدھار

میری تنخواہ کیجئے ماہ بماہ
تا نہ ہو مجھکو زندگی دشوار

ختم کرتا ہوں اب دعا پہ کلام
شاعری سے مجھے نہیں سروکار

تم سلامت رہو ہزار برس !
ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

طائرِ دل

اٹھا اِک دن بگولا سا جو کچھ میں جوشِ وحشت میں

ع۔ خدایا ہم کو آگ کے عذاب سے بچا۔

پھرا آسیمہ سر گھبرا گیا تھا دِل بیابان سے
نظر آیا مجھے اِک طائر مجروح پر بستہ
پٹکتا تھا سر شوریدہ دیوار گلستاں سے
کہا میں نے کہ او ناکام آخر ماجرا کیا ہے
پڑا ہے کام تجھ کو کس ستم گر آفت جاں سے
ہنسا کچھ کھِلکھِلا کر پہلے پھر مجھکو جو پہچانا
تو یوں رو یا کہ جوے خون بہی پلکوں کے داماں سے
کہا میں صید ہوں اُس کا کہ جس کے دامِ گیسو میں
پھنسا کرتے ہیں طائر روز آکر باغ رضواں سے
اسی کی زلف و رخ کا دھیان ہے شام و سحر مجھکو
نہ مطلب کفر سے ہے اور نہ ہے کچھ کام ایمان سے
بہ چشم غور جب دیکھا مرا ہی طائر دل تھا
کہ جل کر ہو گیا یوں خاک اپنی آہ سوزاں سے

چکنی ڈلی

ہے جو صاحب کے کف دست پہ یہ چکنی ڈلی
زیب دیتا ہے اسے جسقدر اچھا کہیے
خامہ انگشت بدنداں کہ اسے کیا لکھیے
ناطقہ سر بہ گریبان کہ اسے کیا کہیے
مہر مکتوب عزیزان گرامی لکھیے
حرز بازوے شکر گمان خود آرا کہیے

مسی آلودہ سر انگشت حسیناں لکھئے
داغ طرفِ جگر عاشق شیدا کہئے

اختر سوختہ قیس سے نسبت دیجے
خالِ مشکین رخ دلکش لیلا کہئے

حجر الاسود دیوار حرم کیجے فرض
نافہ آہوئے بیاباں ختن کا کہئے

وضع میں اسکو اگر سمجھئے قاف تریاق
رنگ میں سبزۂ نوخیز مسیحا کہئے

صومعے میں اسے ٹھہرائیے گر مہر نماز
میکدے میں اسے خشتِ خم صہبا کہئے

کیوں اسے قفل درِ گنج محبت لکھئے
کیوں اسے نقطۂ پرکار تمنا کہئے

کیوں اسے تکمۂ پیراہن لیلا لکھئے
کیوں اسے نقطۂ پرکار تمنا کہئے

کیوں اسے گوہر نایاب تصور کیجے
کیوں اسے مردمکِ دیدۂ عنقا کہئے

بندہ پرور کے کفِ دست کو دل کیجے فرض
اور اس چکنی سپاری کو سویدا کہئے !

بیسنی روٹی

نہ پوچھ اسکی حقیقت حضور والا نے
مجھے جو بھیجی ہے بیسن کی روغنی روٹی

نہ کھاتے گیہوں نکلتے نہ خلد سے باہر
جو کھاتے حضرتِ آدم یہ بیسنی روٹی

شیخ محمد ابراہیم ذوق

شب ہجر

کہوں اے ذوق کیا حال شبِ ہجر
کہ تھی اک اک گھڑی سو سو مہینے

نہ تھی شب ڈال رکھا تھا اک اندھیر
مرے بخت سیہ کی تیرگی نے

شب غم شمع ساں ہوتی نہ تھی کم
اور آتے تھے پسینے پر پسینے

یہی کہتا تھا گھبرا کر فلک سے
کہ او بے مہر بد اختر کمینے

کہاں میں اور کہاں یہ شب مگر تھے
مری جانب سے تیرے دل میں کینے

سواس ظلمت کے پردے میں کئے ظلم
ارے ظالم تری کینہ وری نے

عوض کس بادہ نوشی کے مجھے آج
پڑے یہ زہر کے سے گھونٹ پینے

حواس وہوش جو مجھ سے قریں تھے
قرینے سے ہوئے سب بے قرینے

مری سینہ زنی کا شور سنکر
پھٹے جاتے تھے ہمسایوں کے سینے

اٹھایا گاہ اور گاہے بٹھایا
مجھے بے تابی و بے طاقتی نے

کہا جب دل نے تو کچھ کھا کے سورہ
بہت الماس کے توڑے نگینے

نہ ٹوٹا جان کا قالب سے رشتہ
بہت سی جان توڑی جانکنی نے

بہت دیکھا نہ دکھلایا ذرا بھی
طلوعِ صبح سے منہ روشنی نے

کہا جی نے مجھے یہ ہجر کی رات
یقیں ہی صبح تک دیگی نہ جینے

لگے پانی چوانے منہ میں آنسو
پڑھی یٰسین سرہانے بیکسی نے

مگر دن عمر کے تھوڑے سے باقی
لگا رکھے تھے میری زندگی نے

کہ قسمت سے قریب خانہ میرے
اذان مسجد میں دی بارے کسی نے

بشارت مجھکو صبح وصل کی دی
اذاں کے ساتھ یمن و فرخی نے

ہوئی ایسی خوشی اللہ اکبر
کہ خوش ہو کر کہا خود یہ خوشی نے

مؤذن مرحبا بر وقت بولا
تری آواز مکے اور مدینے

ترک دنیا

کل ایک تارک دنیا سے میں نے پوچھا ذوق
کہ تو اکھڑ کے اِدھر سے اُدھر ہوا پیوست
گذرتی ہوگی بآرام زندگی تیری
کہ تجھ کو اب نہ غم نیست ہے نہ شادیٔ ہست
کہا یہ اُس نے کہ قیدِ حیات میں انساں
کبھی نہ ہوگا دل آسودہ گو ہو مستِ الست
اٹھائے ہاتھ جہاں سے و لیک کیا امکاں
کہ بافراغ کروں کنج عافیت میں نشست
چھٹا جو کوئی گرفتاریوں سے دنیا کی
تو سلسلہ میں فقیری کے پھر ہوا پابست
رہا وہ خدمت مرشد کی قید میں برسوں
کہ حق پرست ہو وہ پہلے جو ہو پیر پرست
گر ایک عمر میں پہنچا مقام اعلےٰ پر
کہا یہ شوق نے ہو ہمت بلند نہ پست
جو دستگاہ تصوف میں بھی ہوئی اس کو
تو یہ ارادہ رہا اور بھی ہوں بالا دست
ہمیشہ جنگ رہی بعد صلح کل کے بھی

کہ نفس دشمن سرکش ہے اس کو دیجے شکست
جو ہوشیار ہے تو وہ ہے شرع کا پابند
پھنسا ہوا ہے وہ کیفیتوں میں گر ہے مست
نہیں ہے دامِ علائق سے مطلق آزادی
مجال کیا کہ نکل جاوے کوئی کر کے جست
کہا ہے خوب کسی نے یہ شعر برجستہ
گیا زبان سے نکل اُس کی جیسے تیر از شست
کہ کرد قطع تعلق کدام شد آزاد
بریدۂ زہمہ با خدا گرفتار ست

نواب مرزا خاں داغ

آموں کا شکریہ

شاہ نے دیں آم بھری کشتیاں
کشتیوں میں آم ہیں جو رنگ رنگ
سرخ ہیں ہے لالہ رخوں کی بہار
زرد میں ہے رنگِ گلِ زعفراں
ایسے کہاں پریوں کے پر سبز سبز
سونگھ کے ہو جائے معطر دماغ
گر کبھی ان آموں کا رس چوس لیں

بحرِ عطا کیا ہی ہوا موجزن
داغ کا گھر آج ہے رشکِ چمن
سبز ہیں ہے سبز خطوں کی پھبن
کیسری پوشوں کی ہے اک انجمن
ایسے کہاں حوروں کے سینے فتن
منہ پہ نگہ ان کے ہے مشکِ ختن
ہونٹ ہی چاٹا کریں شیریں دہن

ع تعلق کس نے الگ کیا اور کون آزاد ہوا جس نے سب سے علیحدگی اختیار کی وہ خدا کا گرفتار رہ گیا۔

انبۂ شیریں جو اسے ہو نصیب
نام بھی شیریں کا نہ لے کوہکن

سیکڑوں قسمیں اسی میوے کی ہیں
پھر ہے یہ افراط کہ لاکھوں ہی من

واقعی اِن آموں کی تعریف میں
کم ہیں جہاں تک کہیں اہل سخن

مجھکو یہ مصرعہ بہت آیا پسند
انبتہ اللہ نباتاً حسن

خواجہ الطاف حسین حالی

نوحہ دہلی

تذکرہ دہلی مرحوم کا اے دوست نہ چھیڑ
نہ سنا جائیگا ہم سے یہ فسانہ ہرگز

داستاں گل کی خزاں میں نہ سنا ناہرگز
ہنستے ہنستے ہمیں ظالم نہ رلانا ہرگز

ڈھونڈتا ہی دل شوریدہ بہانے مطرب
دردانگیز غزل کوئی نہ گانا ہرگز

صحبتیں اگلی مصور ہمیں یاد آئیں گی
کوئی دلچسپ مرقع نہ دکھانا ہرگز

لیکے داغ آئیگا سینے پہ بہت اے سیاح
دیکھ اس شہر کے کھنڈروں میں نہ جانا ہرگز

چپے چپے پہ ہیں یاں گوہر یکتا تہ خاک
دفن ہوگا نہ کہیں اتنا خزانہ ہرگز

کبھی اے علم و ہنر گھر تھا تمہارا دلّی
ہم کو بھولے ہو تو گھر بھول نہ جانا ہرگز

رات آخر ہوئی اور بزم ہوئی زیر و زبر
اب نہ دیکھوگے کبھی لطف شبانہ ہرگز

بزم ماتم تو نہیں بزم سخن ہے حالیؔ
یاں مناسب نہیں رو رو کے رلانا ہرگز

ع خدا نے اسکو اچھا سبزہ لگایا۔

بے اعتدالی

تم اے خود پرستو طبیعت کے بندو — ذرا وصف اپنے سنو کان دھر کے
نہیں کام کا تم کو اندازہ ہرگز — جدھر ڈھل گئے ہو رہے بس اُدھر کے
جو گانے بجانے پہ آئی طبیعت — تو چیخ اٹھے دو دن میں ہمسائے گھر کے
جو مجرے میں بیٹھو تو اٹھو نہ جب تک — کہ اُٹھ جائیں ساتھی سب ایک ایک کر کے
اگر پل پڑے چوسر اور گنجفے پر — تو فرصت ملے شاید اب تم کو مر کے
پڑا مرغ بازی کا لپکا تو جانو — کہ بس ٹھن گئے عزم جنگ تیتر کے
چڑھا بھوت عشق و جوانی کا سر پہ — تو پھر گھاٹ کے آپ ہیں اور نہ گھر کے
پڑا تم کو کھانے کا چسکا تو سمجھو — کہ چھوڑینگے اب آپ دوزخ کو بھر کے
جو پینے پہ آؤ تو پی جاؤ اتنی — رہیں پاؤں کے ہوش جس میں نہ سر کے

جو کھانا تو بے حد جو پینا تو اَت گت
غرض یہ کہ سرکار رہیں پیٹ بھر کے

لایق آدمی دشمن اور دوست دونوں سے فائدہ اٹھا سکتا ہے

قول اک حکیم کا ہے کہ گر غور کیجیے — ہے حق ہیں سب کے دوست سے دشمن مفید تر
اوّل تو سوجھتا ہی نہیں عیب دوست کو — اور سوجھتا ہے تو نہیں لاتا زبان پر
پر ایک بار دشمن اگر دیکھ پائے عیب — سو سو طرح سے وہ اسے کرتا ہے جلوہ گر
دشمن سے بڑھ کے کوئی نہیں آدمی کا دوست — منظور اپنے حال کی اصلاح ہو اگر

اور دوست سے زیادہ نہیں کوئی بدسگال
رکھنا ہو جو کہ دوست کے عیب اس سے مستتر

گو قول ہے متین یہ جو ہی سخن کی تہ
افسوس ہے حکیم کی پہنچی نہ واں نظر

دشمن کے جو کہ طعن سے ہوتے ہیں مستفید
عیب انکے دوست کیوں نہ جتائینگے بےخطر

اور جو کہ دوست سے نہیں سن سکتے اپنے عیب
وہ دشمنوں کے طعن سے کیا ہونگے بہرہ ور

جنکو خدا نے جوہر قابل دیا ہے یاں
موقوف عبرت ان کی نہ دشمن نہ دوست پر

خان بہادر سید اکبر حسین صاحب اکبر الہ آبادی

(آپریشن)

میں نے مرشد سے کیا جاکر یہ اک دن التماس
کارِ دنیا نے بہت مجھکو کیا ہے اب اداس

جلوۂ دنیا نے مجکو کر دیا ہے بے بصر
آخرت پر کچھ نہیں باقی رہی میری نظر

فلسفہ نے مجھکو دکھلایا فقط دنیا کا فیکٹ
میری چشم طبع کو عارض ہے غربی کیٹریکٹ

میرے حق میں کوئی فکر سالویشن کیجیے
ہوسکے تو مذہبی اک آپریشن کیجیے

کی توجہ حضرت مرشد نے میرے حال پر

اِک نظر ڈالی مرے اقوال اور اعمال پر
چشمِ باطن میں دیا نشتر نگاہ تیز کا
کٹ گیا وہ رنگ محسوساتِ کفر انگیز کا
پھر در دل پر مرے تقویٰ کی ٹٹی باندھ دی
آنکھ پر شوق لقائے حق پٹی باندھ دی

سب جانتے ہیں علم سے ہے روشنی روح
بے علم و بے ہنر ہے جو دنیا میں کوئی قوم
تعلیم اگر نہیں ہے زمانے کے حسب حال
بے علم ہے اگر تو وہ انساں ہے ناتمام
نیچر کا اقتضا ہے رہے بن کے وہ غلام
پھر کیا امید دولت و آرام و احترام

تائید وضع ملت و دیں کی کرونگا میں
ہوتا نہیں طبیب مداوا سے دستکش
اہل زمانہ لاکھ ہنسیں مجھ غریب پر
سچ ہے اجل تو ہنستی ہے سعی طبیب پر

جب لطف و کرم سے پیش آئے محبوب
جب مثل نسیم وہ گلے سے لگ جائے
اگلے رنجوں کو بھول جانا اچھا
مانند کلی کے پھول جانا اچھا

بے پردہ کل جو آئیں نظر چند بیبیاں
پوچھا جو اُن سے آپ کا پردہ وہ کیا ہوا
اکبر زمیں میں غیرت قومی سے گڑ گیا
کہنے لگیں کہ عقل پہ مردوں کی پڑ گیا

کہتا ہوں میں ہندو مسلمان سے یہی
لاٹھی سے ہوا ہے دہر پانی بنجاؤ

اپنی اپنی روش پہ تم نیک رہو
موجوں کیطرح لڑو مگر ایک رہو

سیّد علی حیدر طبا طبائی لکھنوی

شرکتِ محفل

تو ہمیشہ رہتا ہے چیں برجبیں افسردہ حال
خود ہی اپنی جان سے ہے بیزار تو انصاف کر
چاہیئے اس طرح جانا محفلِ احباب میں
خیر مقدم کا اشارہ جھوم کر کرتی ہے شاخ
جس شجر کے پاس سے گذری لگا وہ جھومنے
دل پہ جو گذرے وہ گذرے کیوں کسی کو ہو خبر

پھر کسی کی بزم عشرت میں نہ جا بہر خدا
تجھ سے اہل بزم پھر کس طرح خوش ہونگے بھلا
باغ میں جس طرح خوش خوش جاتی ہے بادِ صبا
اور چٹک کر دیتی ہیں کلیاں صدائے مرحبا
پہنچی جس غنچہ تک افسردہ تھا وہ ہنسے لگا
سب سے بڑھ کر ہے خدا تو حال دل کا جانتا

شادی و غم جبکہ دونوں ہیں جہاں میں بے ثبات
وقت اپنا کاٹ دے ہنس بول کر مرد خدا

سیّد علی کامل لکھنوی

مزار دوست

شب کو جا نکلا تھا کامل میں مزار دوست پر

مثل ابر اس واسطے آنکھیں مری خونبار ہیں
قبر پر الحمد پڑھ کر دوست سے میں نے کہا
ہم گریباں چاک ماتم میں ترے اے یار ہیں
شاد ہے تو کچھ بھی زیرِ خاک اے نازک بدن
شمع روشن ہے گلوں سے قبر پر انبار ہیں
کیا ہوا مرنے کے بعد اے راہیِ ملکِ عدم؟
لوگ کیسے ہیں وہاں کے اور کیا اطوار ہیں؟
منزلیں نزدیک ہیں یا دور ہیں کیا حال ہے
راہ میں کچھ بستیاں ہیں شہر ہیں بازار ہیں؟
جس محل میں جا کے تو اُترا ہے اے رنگیں ادا
کس طرح کا قصر ہے کیسے در و دیوار ہیں
اہلِ صحبت کون ہیں کیا گفتگو کا طرز ہے
خوش بیاں خوش وضع یا کج فہم بد گفتار ہیں؟
بات کرنے کی صدا اصلا کبھی آتی نہیں
کس طرح کے لوگ ہیں سوتے ہیں یا بیدار ہیں؟
قبر سے آئی صدا اے دوست بس خاموش رہ
ہم اکیلے ہیں یہاں احباب نہ اغیار ہیں
پھول کیسے باغ کیسا عقل تیری ہے کہاں
کنج تنہائی ہے اور افعی گلے کے ہار ہیں

گر تھیں وہ پیکرِ نازک ہمارا یاد رہو
آج خاک قبر سے اسپر منوں کے بار ہیں
اب زیادہ بات کر سکتے نہیں لے گھر کو جا
دل میں آزردہ نہ ہونا کیا کریں ناچار ہیں

ڈاکٹر سر محمد اقبال

ایک آرزو

دنیا کی محفلوں سے اکتا گیا ہوں یارب
شورش سے بھاگتا ہوں دل ڈھونڈتا ہے میرا
مرتا ہوں خامشی پر یہ آرزو ہے میری
آزاد فکر سے ہوں عزت میں دن گذاروں
لذت سرود کی ہو چڑیوں کے چہچہیں
گل کی کلی چٹک کر پیغام دے کسی کا
ہو ہاتھ کا سرہانہ سبزہ کا ہو بچھونا
مانوس اسقدر ہو صورت سے میری بلبل
صف باندھے دونوں جانب بوٹے ہرے ہوں
ہو دلفریب ایسا کہسار کا نظارہ
آغوش میں زمیں کی سویا ہوا ہو سبزہ

کیا لطف انجمن میں جب دل ہی بجھ گیا ہو
ایسا سکوت جس پر تصویر بھی فدا ہو
دامن میں کوہ کے اک چھوٹا سا جھونپڑا ہو
دنیا کے غم کا دل سے کانٹا نکل گیا ہو
چشمے کی شورشوں میں باجا سا بج رہا ہو
ساغر ذرا سا گویا مجھکو جہاں نما ہو
شرمائے جس سے جلوت خلوت میں وہ ادا ہو
ننھے سے دل میں اُسکے کھٹکا نہ کچھ مرا ہو
ندی کا صاف پانی تصویر لے رہا ہو
پانی بھی موج بنکر اُٹھ اُٹھ کے دیکھتا ہو
پھر پھر کے جھاڑیوں میں پانی چمک رہا ہو

پانی کو چھو رہی ہو جھک جھک کے گل کی ٹہنی
جیسے حسین کوئی آئینہ دیکھتا ہو

مہندی لگائے سورج جب شام کی دلہن کو
سرخی لئے سنہری ہر پھول کی قبا ہو

راتوں کو چلنے والے رہ جائیں تھک کے جس دم
اُمید اُن کی میری ٹوٹا ہوا دیا ہو

بجلی چمک کے اُن کو کُٹیا مری دکھا دے
جب آسماں پہ ہر سو بادل گھرا ہوا ہو

پچھلے پہر کی کوئل وہ صبح کی مؤذن!
میں اُسکا ہمنوا ہوں وہ میری ہمنوا ہو

کانوں پہ ہو نہ میرے دیر و حرم کا احساں
روزن ہی جھونپڑی کا مجھکو سحر نما ہو

پھولوں کو آئے جس دم شبنم وضو کرانے
رونا مرا وضو ہو نالہ مری دعا ہو

اس خامشی میں جائیں اتنے بلند نالے
تاروں کے قافلے کو میری صدا درا ہو

ہر دردمند دل کو رونا مرا رلا دے
بیہوش جو پڑے ہیں شاید انہیں جگا دے

عقل و دل

عقل نے ایک دن یہ دل سے کہا
بھولے بھٹکے کی رہنما ہوں میں

ہوں زمیں پر گذر فلک پہ مرا
دیکھ تو کس قدر رسا ہوں میں

کام دنیا میں رہبری ہے مرا
مثل خضر خجستہ پا ہوں میں

ہوں مفسر کتاب ہستی کی
مظہر شان کبریا ہوں میں

بوند اک خون کی ہے تو۔ لیکن
غیرت لعل بے بہا ہوں میں

دل نے سنکر کہا یہ سب سچ ہے
پر مجھے بھی تو دیکھ کیا ہوں میں

راز ہستی کو تو سمجھتی ہے
اور آنکھوں سے دیکھتا ہوں میں

ہے تجھے واسطہ مظاہر سے — اور باطن سے آشنا ہوں میں
علم تجھ سے تو معرفت مجھ سے — تو خدا جو خدا نما ہوں میں
علم کی انتہا ہے بے تابی — اس مرض کی مگر دوا ہوں میں
شمع تو محفلِ صداقت کی — حسن کی بزم کا دیا ہوں میں
تو زمان و مکاں سے رشتہ بپا — طائر سدرہ آشنا ہوں میں

کس بلندی پہ ہے مقام مرا
عرش رب جلیل کا ہوں میں

نظم کی وہ قسم ہے جس میں متعدد بند ہوتے ہیں۔ ہر بند میں چھ مصرعے ہوتے ہیں۔ پہلے چار مصرعے ایک قافیہ میں اسکے بعد دو مصرعے دوسرے قافیہ میں کہکر پہلے چار مصرعوں کیساتھ ملحق کر دیتے ہیں۔

میر ببر علی انیس

ولادت فیض آباد سنہ ۱۲۱۶ھ — وفات لکھنؤ سنہ ۱۲۹۱ھ

مناجات

یارب چمن نظم کو گلزار ارم کر — اے ابر کرم خشک زراعت پہ کرم کر

توفیض کا مبدا ہے توجہ کوئی دم کر　　گمنام کو اعجاز بیانوں میں رقم کر
جبتک یہ چمک مہر کے پرتو سے نہ جائے
اقلیم سخن میرے قلمرو سے نہ جائے

اس باغ میں جتنے ہیں ترے فیض کے جاری　　بلبل کی زبان پر ہے تری شکرگذاری
ہر نخل برومند ہے یا حضرتِ باری　　پھل ہمکو بھی مل جائے ریاضت کا ہماری
وہ گل ہوں عنایت چمن طبع نکو کو
بلبل نے بھی سونگھا نہ ہو جن پھولوں کی بو کو

غواص طبیعت کو عطا کر وہ لآلی　　ہو جن کی جگہ تاج سر عرش پہ خالی
ایک ایک لڑی نظم ثریا سے ہو عالی　　عالم کی نگاہوں سے گرے قطب شمالی
سب ہوں در یکتا نہ علاقہ ہو کسی سے
نذر اُن کی یہ ہونگے جنہیں رشتہ ہے نبی سے

بھردے در مقصود سے اس درج دہاں کو　　دریائے معانی سے بڑھا طبع رواں کو
آگاہ کر اندازِ تکلم سے زباں کو　　عاشق ہو فصاحت بھی وہ دے حسن زبانکو
تحسیں کا سموات سے غل تا بہ سمک ہو
ہر گوش بنے کانِ ملاحت وہ نمک ہو

ساقی کے کرم سے ہو وہ دور اور چلے جام　　جس سے عوض نشہ ہو کیفیت انجام
ہر مست فراموش کرے گردشِ ایام　　صوفی کی زباں بھی نہ رہے فیض سے ناکام
ہاں بادہ کشو پوچھ لو میخانہ نشیں سے
کوثر کی یہ موج آگئی ہے خلد بریں سے

آؤں طرفِ رزم ابھی چھوڑ کے جب بزم
قطع سرِ اعدا کا ارادہ ہو جو بالجزم
خیبر کی خبر لائے مری طبع اولوالعزم
دکھلائے یہیں سب کو زبان معرکہ رزم
جل جائے عدو آگ بھڑکتی نظر آئے
تلوار پہ تلوار چمکتی نظر آئے

راحتِ پسر

نعمت کوئی دنیا میں پسر سے نہیں بہتر
لذت کوئی پاکیزہ ثمر سے نہیں بہتر
راحت کوئی آرام جگر سے نہیں بہتر
نگہت کوئی بوئے گل تر سے نہیں بہتر
صدموں میں علاجِ دلِ مجروح یہی ہے
ریحاں ہے یہی روح یہی روح یہی ہے

ماں باپ کا دل غنچۂ خنداں ہے اسی سے
سب راحت و آرام کا ساماں ہے اسی سے
وہ گل ہے کہ گھر رشکِ گلستاں ہے اسی سے
آبادیٔ کاشانۂ انساں ہے اسی سے
کس طرح کھلے دل کہ جگر بند نہیں ہے
گھر قبر سے بدتر ہے جو فرزند نہیں ہے

یہ وہ ہے عصا پیر جواں رہتا ہے جس سے
وہ شمع ہے پر نور جہاں رہتا ہے جس سے
یہ وہ ہے نگیں نام و نشاں رہتا ہے جس سے
وہ ڈور ہے قوی رشتۂ جاں رہتا ہے جس سے
کھوتے نہیں یہ مال زر و مال کے بدلے
موتی بھی لٹا دیتے ہیں اس لال کے بدلے

دنیا میں بس اک مرجعِ آمال یہی ہے
ثروت یہی حشمت یہی اقبال یہی ہے

سرمایہ یہی نقد یہی مال یہی ہے — گوہر یہی یاقوت یہی لال یہی ہے

دلبند ہو پہلو میں تو غم پاس نہیں ہے
کچھ پاس نہیں گر یہ رقم پاس نہیں ہے

ماں باپ کی آسایش و راحت ہے پسر سے — تلخی میں بھی جینے کی حلاوت ہے پسر سے
خون جسم میں آنکھوں میں بصارت ہے پسر سے — ایامِ ضعیفی میں بھی طاقت ہے پسر سے

آرامِ جگر قوتِ دل راحتِ جاں ہے
پیری میں یہ طاقت ہے کہ فرزند جواں ہے

وہ شے ہے خوشی در پہ کھڑی رہتی ہے جس سے — وہ چین ہے راحت کی گھڑی رہتی ہے جس سے
وہ لعل ہے امید بھری رہتی ہے جس سے — وہ دُر ہے یہ جان لڑی رہتی ہے جس سے

آرامِ جگر تاب و تواں ساتھ ہے اس کے
پھرتا ہے جدھر راحتِ جاں ساتھ ہے اس کے

صبح کا سماں

وہ صبح اور وہ چھاؤں ستاروں کی اور وہ نور — دیکھے تو غش کرے اَرِنی گوئے اوجِ طور
پیدا گلوں سے قدرتِ اللہ کا ظہور — وہ جا بجا درختوں پہ تسبیح خواں طیور

گلشن خجل تھے وادیٔ مینو اساس سے
جنگل تھا سب بسا ہوا پھولوں کی باس سے

ٹھنڈی ہوا وہ سبزۂ صحرا کی وہ لہک — شرمائے جس سے اطلسِ زنگاریٔ فلک
وہ جھومنا درختوں کا پھولوں کی وہ مہک — ہر برگِ گل پہ قطرۂ شبنم کی وہ چمک

ہیرے خجل تھے گوہر یکتا نثار تھے
پتے بھی ہر شجر کے جواہر نگار تھے

وہ نور اور وہ دشت سہانا سا وہ فضا
دراج و کبک و تیتر و طاؤس کی صدا

وہ جوشِ گل وہ نالۂ مرغانِ خوش نوا
سردی جگر کو بخشتی تھی صبح کی ہوا

پھولوں سے سبز سبز شجر سرخ پوش تھے
تھالے بھی نخل کے سبدِ گل فروش تھے

وہ قمریوں کا چار طرف سرو کے ہجوم
کوکو کا شور نالۂ حق سرہ کی دھوم

سُبْحَانَ رَبِّنَا کی صدا تھی علی العموم
جاری تھے وہ جو اُنکی عبادت کے تھے رسوم

کچھ گل فقط نہ کرتے تھے ربِ علا کی مدح
ہر خار کو بھی نوکِ زباں تھی خدا کی مدح

چیونٹی بھی ہاتھ اٹھا کے یہ کہتی تھی بار بار
اے دانہ کش ضعیفوں کے رازق ترے نثار

یا حی و یا قدیر کی تھی ہر طرف پکار
تسبیح تھی کہیں کہیں تحلیل کردگار

طائر ہوا میں مست ہرن سبزہ زار میں
جنگل کے شیر گونج رہے تھے کچھار میں

تلوار

بجلی چمک کے ہوتی تھی جب آسماں کے پار
پڑھتا تھا عرش آیۂ کرسی کو بار بار

زیرِ زمیں تو گاؤ زمیں کو نہ تھا قرار
تھرا رہا تھا نورِ فلک وقتِ گیر و دار

غل تھا علی کی تیغ کا سب رنگ ڈھنگ ہے

۶۷۔ پاک ہے ہمارا رب۔

جبریل کانپتے تھے کہ خیبر کی جنگ ہے

اقبال و تندرستی و آسائش و قرار
حلم و سکون و راحت و آرام و اختیار
امن و امان و صبر و توانائی و وقار
رعب و ثبات و سرکشی و صبر و اقتدار
آثار قہر حق انہیں معلوم ہو گئے
سب تیغ کے چمکتے ہی معدوم ہو گئے

غل تھا چمکتی آئی ہے تیغ اجل چلو
دبکر صدا غرور نے دی سر کے بل چلو
ڈر کر کہا اماں نے کہ قبل از جدل چلو
بولی سلامتی کہ سلامت نکل چلو
دریا بہے گا خوں کا کنارے فرات کے
دم بھر میں بند ہوئیں گے کوچے نجات کے

چمکی جو تیغ، آمد قہر خدا ہوئی
سینے سے روح جسم سے گردن جدا ہوئی
سر پر جو آگئی تو قیامت بپا ہوئی
خوں میں ڈبو چکی تو نہ پھر آشنا ہوئی
باڑھ اس غضب کی وار وہ اس زور شور کا
دشمن کو اس کا وار کنارہ تھا گور کا

یوں مورچوں کو چاٹ گئی تیغ شعلہ رنگ
کمروں سے کھنچ نہ سکتے تھے خنجر میان جنگ
لوہے کو خاک شور میں کھا جائے جیسے زنگ
جوشن جو کٹ گئی تھی تو چار آئینے تھے دنگ
تلواریں منہ چھپائے تھیں ضرب درشت سے
ڈھالیں لپٹ گئی تھیں سواروں کی پشت سے

کاٹی سپر تو کاسہ سر تک پہنچ گئی!
برسے مثال برق جگر تک پہنچ گئی
سر پر پڑی تو پیر کے بر تک پہنچ گئی
پی کر لہو جگر کا کمر تک پہنچ گئی

بڑھ کر کرے زین پہ آئی سرنگ کے
ٹکڑے گرے نہ تھے کہ یہ نیچے تھی تنگ کے

نکلا اُدھر سے وہ جو اجل کا شکار تھا
کوسوں لہو سے دشت ستم لالہ زار تھا
پیدل ہو یا سوار ہو یہ دو وہ چار تھا
بجلی چمک رہی تھی فرس بیقرار تھا

کیا ہو زرہ سے ضرب جب ایسی کڑی لگے
سر یوں برس رہے تھے کہ جیسے جھڑی لگے

دنیا

دنیا بھی عجب گھر ہے کہ راحت نہیں جسمیں
وہ دوست ہے یہ دوست محبت نہیں جسمیں
وہ گل ہے یہ گل بوئے محبت نہیں جسمیں
وہ شہد ہے یہ شہد حلاوت نہیں جسمیں

بے درد و الم شام غریباں نہیں گذری
دنیا میں کسی کی کبھی یکساں نہیں گذری

گودی میں کبھی ماں کے کبھی قبر کا آغوش
سرگرم سخن ہے کبھی انسان کبھی خاموش
گل پیرہن اکثر نظر آتے ہیں کفن پوش
گہ تخت ہے اور گاہ جنازہ بسر دوش

اک طور پہ دیکھا نہ جواں کو نہ مُسن کو
شب کو تو چھپر کھٹ میں تو تابوت میں دن کو

کرتا نہیں غربت میں کوئی آکے مدد تک
پھر آتے ہیں رُوتے ہوئے پہنچا کے لحد تک
گر ساتھ گیا ہے تو کوئی قبر کی حد تک
وہ خانۂ تاریک میں تنہائی ابد تک

نہ دوست نہ احباب نہ ہم بزم گئے ہیں

تنہا یوں ہی شاہانِ اولوالعزم گئے ہیں

شادی ہو کہ اندوہ ہو آرام ہو یا جور
ماتم کی کبھی فصل ہے عشرت کا کبھی دور

دنیا میں گذر جاتی ہے انساں کی بہر طور
ہے شادی ماتم کا مرقع جو کرو غور

کس باغ میں آسیب خزاں آ نہیں جاتا
گل کون سا کھلتا ہے جو مرجھا نہیں جاتا

مرگِ پسر

جیتا نہیں وہ جس کے مقدر میں ہے مرنا
آفت تو ہے فرزند کا دنیا سے گذرنا

مشکل ہے مگر صبر کی سل چھاتی پہ دھرنا
انسان کو لازم ہے مگر صبر ہی کرنا

برسوں سے یہی رنگ گلستان جہاں ہے
جس گل پہ بہار آج ہے کل اُس پہ خزاں ہے

کچھ پھول تو دکھلا کے بہار اپنی ہیں جاتے
کچھ گل ہیں کہ پھولے نہیں جامے میں سماتے

کچھ سوکھ کے کانٹوں کی طرح ہیں نظر آتے
غنچے بہت ایسے ہیں جو کھلنے نہیں پاتے

بلبل کی طرح روتے ہیں فریاد و فغاں سے
کچھ بس نہیں چلتا چمن آرائے جہاں سے

مرتا ہے جواں سامنے اور دیکھتے ہیں پیر
سر پیٹ کے فریاد کرے مادرِ دلگیر

ماں باپ کا کیا زور ہے جو خواہش تقدیر
جز صبر بن آتی نہیں لیکن کوئی تدبیر

آرام جسے دیتے ہیں چھاتی پہ سُلا کر

رکھ آتے ہیں ہاتھوں سے اُسے قبر میں جاکر

مٹی سے بچاتے ہیں سدا جن کا تن پاک
اُس گل پہ گرا دیتے ہیں اب سینکڑوں من خاک
مادر جسے عریاں نہیں کرتی تہ افلاک
وہ قبر میں سوتا ہے دہری رہتی ہے پوشاک

غربت میں کوئی پوچھنے والا نہیں ہوتا!
شمعیں بھی جلاؤ تو اجالا نہیں ہوتا

سفر آخرت

کچھ دن بشر اس خانہ دنیا میں ہے مہماں
دستِ ملک الموت میں ہے سب کا گریباں
زندوں میں ہیں گر آج تو کل ہوویں گے بیجاں
پہلے سے ہے لازم سفر مرگ کا ساماں

اعمال و عقائد میں نہ ہر گز خلل آئے۔
کیا جانئے کس وقت پیامِ اجل آئے

بھائی نہ تو کام آئیگا اسوقت نہ فرزند
عرصہ نہیں۔ کھلجائیگا جب آنکھ ہوئی بند
وہ کام کرو جس سے خدا ہووے رضا مند
ہوشیار کہ ہونا ہے تمہیں خاک کا پیوند

پیری کی بھی مدت ہے جوانی کی بھی حد ہے
آرام گہ شاہ و گدا کنج لحد ہے

اِس زیست پہ پھولو نہ اجل کو بھی کرو یاد
گھر سینکڑوں یاں سیل فنانے کئے برباد
دنیا میں عمارت نہ بنا کر ہو کوئی شاد
اس قالب خاکی کی عجب سُست ہے بنیاد

کل اوج پہ جو لوگ تھے وہ زیر زمیں ہیں
ہے خاک کا ڈھیر اب یہ مکاں ہیں نہ مکیں ہیں

دنیا یہ سدا عبرت و اندیشہ کی جا ہے
جاتے ہیں چلے مرگ کا دروازہ کھلا ہے
یاں کیسا مقام آٹھ پہر کوچ لگا ہے
رہ جائے نہ کوئی یہی آوازِ درا ہے

ہے راہ کڑی زادِ سفر پاس نہیں ہے
منزل پہ پہنچنے کی ہمیں آس نہیں ہے

نواب مرزا خاں داغ

شہر آشوب

فلک زمین و ملائک جناب تھی دلّی
جواب کا ہے کو تھا لاجواب تھی دلّی
بہشت و خلد سے بھی لاجواب تھی دلّی
مگر خیال سے دیکھا تو خواب تھی دلّی

پڑی ہیں آنکھیں وہاں جو جگہ تھی نرگس کی
خبر نہیں کہ اسے کھا گئی نظر کس کی

یہ شہر وہ ہے کہ انسان و جان کا دل تھا
یہ شہر وہ ہے کہ ہندوستان کا دل تھا
یہ شہر وہ ہے کہ ہر قدر دان کا دل تھا
یہ شہر وہ ہے کہ سارے جہان کا دل تھا

رہی نہ آدھی یہاں سنگ و خشت کی صورت
بنی ہوئی تھی جو ساری بہشت کی صورت

یہاں کی شام تھی مانندِ صبح نورانی
یہاں کے سنگ سے تیرہ تھا لعلِ رمانی
یہاں کے ذرہ میں تھی مہر کی درخشانی
یہاں کی خاک سے ہوتا تھا آئینہ پانی

یہ شہر وہ ہے کہ سایہ بھی نور تھا اس کا

چراغ رشکِ تجلی طور تھا اس کا

خدا پرستوں کا شیوہ جفا پرستی ہے
بجائے ابرِ کرم مفلسی پرستی ہے
جو مال مست تھے اب انکو فاقہ مستی ہے
بہ تنگ جینے سے ہیں ایسی تنگدستی ہے

غضب میں آئی رعیت بلا میں شہر آیا
یہ پوربئے نہیں آئے خدا کا قہر آیا

عجیب شکل گل و گلستاں نظر آئی
جب اُٹھ کے تا مژہ خونچکاں نظر آئی
پڑیں جدھر کو نگاہیں خزاں نظر آئی
تو کوئی عیش کی صورت نہ یاں نظر آئی

وہ گلرخان سمن بر کے قہقہے نہ رہے
وہ بلبلان خوش الحان کے چہچہے نہ رہے

فلک نے قہر و غضب تاک تاک کر ڈالا
یکا یک ایک جہاں کو ہلاک کر ڈالا
تمام پردہ ناموس چاک کر ڈالا
غرض کہ لاکھ کا گھر اُس نے خاک کر ڈالا

جلی ہیں دھوپ میں شکلیں جو ماہتاب کی تھیں
کھنچیں ہیں پتیاں کانٹوں میں جو گلاب کی تھیں

زمیں کے حال پر اب آسماں روتا ہے
گدا و شاہ و ضعیف و جوان روتا ہے
ہر اک فراق مکیں میں مکان روتا ہے
غرض یہاں کیلئے اک جہاں روتا ہے

جو کہئے جوشش طوفاں نہیں کہی جاتی
یہاں تو نوح کی کشتی بھی ڈوب ہی جاتی

برنگ بوئے گل اہل چمن چمن سے چلے
نہ پوچھو زندوں کو بیچارے کس چلن سے چلے
غریب چھوڑ کے اپنا وطن وطن سے چلے
قیامت آئی کہ مردے نکل کفن سے چلے

مقامِ امن جو ڈھونڈا تو راہ بھی نہ ملی
یہ قہر تھا کہ خدا کی پناہ بھی نہ ملی

جگہ جگہ تھے زمیندار دار کی صورت — چڑھے ہی آتے تھے سر پہ بخار کی صورت
بلا سے کم نہ تھی ہر اک گنوار کی صورت — چھپی نہ اُن سے پر اہلِ دیار کی صورت

کسی جگہ جو کوئی ہو کے بیقرار آیا
تو اہلِ قریہ یہ بولے کہ لو شکار آیا

زباں جو بدلیں تو صورت بدل نہیں آتی — ملیں جو خاک بھی منہ پر تو مل نہیں آتی
کسی طرح کسی پہلو سے کل نہیں آتی — پکارتے ہیں اجل کو اجل نہیں آتی

جو سر کو پھوڑیں تو پتھر پرے سرکتے ہیں
جو لوٹیں کانٹوں پہ کانٹے الگ کھسکتے ہیں

پیادہ پا ہوں رواں شہسوار صد افسوس — لہو کے گھونٹ پئیں بادہ خوار صد افسوس
ذلیل و خوار ہوں اہلِ وقار صد افسوس — ہزار حیف دلِ بیقرار صد افسوس

جھکے ہیں بارِ الم سے تنے ہوئے کیسے
بگڑ گئے ہیں یکایک بنے ہوئے کیسے

کہاں تک آہ لکھوں اسکا حال بربادی — کہاں تک آہ لکھوں آسماں کی جلادی
کسی کو قیدِ محن سے نہیں ہے آزادی — کہ داغ داغ ہے دل ہر کوئی ہے فریادی

الٰہی پھر اسے آباد شاد دیکھیں ہم
الٰہی پھر اسے حسبِ مراد دیکھیں ہم

شمس العلما خواجہ الطاف حسین حالی

ولادت پانی پت ۱۸۳۷ء ۔ وفات پانی پت ۱۹۱۴ء

یادِ ایام

یادِ ایام کہ بیرنگ تھی تصویرِ جہاں
گُل خود رو سے بسا تھا چمنِ کون و مکاں

دستِ مشاطہ نہ تھا محرمِ زلفِ دوراں
چار سو حسنِ خداداد کا سِکہ تھا رواں

وضعِ عالم میں نہ آیا تھا تغیر اب تک
خطِ قدرت کی وہی شان تھی اور نوک پلک

طفلِ معصوم کے مانند تھا یہ عالمِ پیر
ملکِ فطرت میں تھی سلطنتِ نقشِ تحریر

تھے ہم اک صنعتِ بیچون و چرا کی تصویر
طبع نے مملکتِ روح نہ کی تھی تسخیر

خوابِ غفلت کی گھٹا دل پہ نہ چھائی تھی بہت
دن چھپا تھا ابھی اور رات نہ آئی تھی بہت

مال و دولت کی ہوس میں گرفتار تھی ہم
آپ ہی اپنے ہر اک رنج میں غمخوار تھے ہم

نہ بلندی کے نہ رفعت کے طلبگار تھے ہم
مددِ غیر سے اصلا نہ خبردار تھے ہم

جو سبق آئے تھے اُستادِ ازل سے لیکر
وہی ہر منزل و ہر راہ میں تھا یاں رہبر

اصل سے دور بہت ہونے نہ پائے تھے ابھی
دن جدائی کے نصیبوں نے دکھائے تھے ابھی

دیس سے چھوٹ کے پردیس میں آئے تھے ابھی
ڈال سے توڑ کے بازار میں لائے تھے ابھی

عرصہ گذرا تھا مسافر کو نہ غربت میں بہت
جی لگا تھا نہ ابھی غیروں کی صحبت میں بہت

اسقدر عمر دو روزہ پہ نہ مغرور تھے ہم
عیش و عشرت کے طلسموں سے بہت دور تھے ہم
کسی محنت سے مشقت سے نہ معذور تھے ہم
آپ ہی راج تھے اور آپ ہی مزدور تھے ہم

تھے غلام آپ ہی اور آپ ہی آقا اپنے
خود ہی بیمار تھے اور خود ہی مسیحا اپنے

خود نمائی و خود آرائی کا کچھ دھیان نہ تھا
کبر و پندار کا جاری کہیں فرمان نہ تھا
گھر میں سامان نہ تھا در پہ نگہبان نہ تھا
جی میں فرعون زمان بننے کا ارمان نہ تھا

آکے دنیا میں بہت پاؤں نہ پھیلاتے تھے
اک مسافر کی طرح رہ کے چلے جاتے تھے

آمدِ موسمِ گل میں تھا عجب لطف ہوا
آندھیوں نے کیے انجام کو طوفان برپا
چشمہ نزدیک تھا منبع سے تو تھا عین صفا
جتنا بڑھتا گیا ہوتا گیا پانی گدلا

مٹتے مٹتے اثر صدق و صفا کچھ نہ رہا
آخری دور میں تلچھٹ کے سوا کچھ نہ رہا

ننگ خدمت

نوکری ٹھیری ہے لے دیکے اب اوقات اپنی
پیشہ سمجھے تھے جسے ہوگئی وہ ذات اپنی
اب نہ دن اپنا رہا اور نہ رہی رات اپنی
جا پڑی غیر کے ہاتھوں میں ہر اک بات اپنی

ہاتھ اپنے دلِ آزاد سے ہم دھو بیٹھے

ایک دولت تھی ہماری سو اسے کھو بیٹھے

در مخلوق کو ہم ملجا و ماویٰ سمجھے
طاعتِ خلق کو اعزاز کا تمغہ سمجھے
پیشہ و حرفہ کو اجلاف کا شیوہ سمجھے
ننگِ خدمت کو شرافت کا تقاضا سمجھے

عیب گننے لگے نجّاری و حدّادی کو
بیچتے پھرنے لگے جوہر آزادی کو

کرتے ہیں قصدِ تجارت تو گرہ میں نہیں دام
دستکاری کو سمجھتے ہیں کہ ہے کارِ عوام
نہیں ہل جوتنے میں راحت و آرام کا نام
بنتے پھرتے ہیں اسی واسطے ہر اک کے غلام

نظر آتی نہیں مطلب کی کوئی گھات ہمیں
وہ پڑا نقشہ کہ ہر چال میں ہے مات ہمیں

ایک آقا ہو تو خدمت کا ہو حق اسکی ادا
ایک افسر ہو تو حکم اس کا کوئی لائے بجا
زید کی رائے جدا عمرو کی تجویز جدا
ایک بندہ کو بھگتنے کئی پڑتے ہیں خدا

بھاگو خدمت سے کہ اچھا نہیں انجام اسکا
جس کا پتھر کا کلیجہ ہو وہ لے نام اس کا

آتی ہیں نوکروں کے سر پہ بلائیں اکثر
بے سبب اُن پہ گذرتی ہیں جفائیں اکثر
ماننی پڑتی ہیں ناکردہ خطائیں اکثر
سامنے جلتے ہیں پڑھ پڑھ کے دعائیں اکثر

غیرت آئی جنہیں وہ ٹھیرتے پاتے نہیں یاں
جو کہ غافل ہیں کبھی کان ہلاتے نہیں یاں

کیجئے فرض کہ ہے زید بڑا منصب دار
اور عمرو اسکا ہے اک بندۂ فرمان بردار
فرق دونوں میں نہیں اسکے سوا کچھ زنہار
کہ یہ میلا ہے وہ اُجلا یہ پیادہ وہ سوار

ورنہ انصاف سے دیکھو تو ہیں نوکر دونوں
قید میں عجز میں ذلت میں برابر دونوں !

رکھتے ہیں حضرت انساں جو بڑائی میں قدم
مالکوں کے انہیں گر جھیلنے پڑتے ہیں ستم
گاؤ خر دیکھئے تو ان سے ہیں کس بات میں کم
ذلتیں انکے لئے بھی ہیں مہیا ہر دم

ننگِ خدمت کی حقیقت کو بشر گر سمجھے
چاکروں کو گدھے اور بیل سے بدتر سمجھے

ان کی گردن میں اگر قید کی رسی ہے پڑی
تازہ حکموں کی لگی رہتی ہے ہر وقت جھڑی
اپنی بے بال و پری کی بھی کہانی ہے بڑی
نہیں خالی کوئی ساعت کوئی پل کوئی گھڑی

مرغ بے پر کی طرح قیدی صیاد ہیں ہم
کہئے پھر کونسی حجت ہے کہ آزاد ہیں ہم

نوکروں سے ہیں بہائم کہیں رتبہ میں سوا
گائے ہو بیل ہو گھوڑا ہو کہ ہو اسمیں گدھا
کہ نہیں خدمت ہم جنس کا انپر دھبا
ایک کو ایک کا تابع کہیں دیکھا نہ سنا

کسی مخلوق کو رتبہ نہ خدا نے بخشا
جو غلاموں کو شرف عقل رسا نے بخشا

ایک وہ ہیں کہ نہیں غیر کے فرماں بردار
نہیں سرکار سے دربار سے ان کو سروکار
اپنی ہر بات کے ہر کام کے ہیں خود مختار
جس جگہ بیٹھ گئے ہے وہی انکا دربار

گر تونگر ہیں تو دس بیس ہیں ان کے محکوم
ورنہ خادم ہیں کسی کے نہ کسی کے مخدوم

ایک وہ ہیں کہ زمانہ کرے انصاف اگر
اور کھل جائیں کمالات بھی انکے سب پر

جوہری جو ہیں وہ سب انکے پرکھ لیں جوہر
کامیابی نہیں انکے لئے اس سے بڑھکر

کہ سدا قید رہیں مرغِ خوش الحاں کی طرح
جا کے بک جائیں کہیں یوسفِ کنعاں کی طرح

دیکھ لیں جب انہیں ہر علم و ہنر میں یکتا
شرف ذات میں اور اصل گہر میں یکتا
زور بازو میں بلندیٔ نظر میں یکتا
الغرض جملہ کمالات بشر میں یکتا

اور پھر اُس پہ مدد طالع بیدار کی ہو
تب نصیب اُن کو غلامی کسی سرکار کی ہو

ورنہ دن رات پھریں ٹھوکریں کھاتے در در
سندیں چٹھیاں پرولنے دکھاتے در در
چاپلوسی سے دل اک اک کا لبھاتے در در
ذائقہ نفس کو ذلت کا چکھاتے در در

تاکہ ذلت سے بسر کرنیکی عادت ہو جائے
نفس جس طرح بنے لایق خدمت ہو جائے

کوئی دفتر نہیں اور کوئی کچہری ایسی
کہ جہاں گذری ہو اک آدھ نہ عرضی انکی
سنتے مشرق میں ہیں گر کوئی اسامی خالی
قافلے ہوتے ہیں مغرب سے اُسی دم راہی

برسوں اسپر بھی گذر جاتے ہیں بے نیل مرام
کوئی آقا نہیں ملتا کہ بنیں اسکے غلام

جن کو منظور ہے مشکل کو نہ دشوار کریں
چاہیے سعی و مشقت سے نہ وہ عار کریں
ہو میسر جنہیں وہ خدمتِ سرکار کریں
ورنہ مزدوری و محنت سر بازار کریں

آبرو اس میں ہے شانِ اس میں ہے شوکت اسمیں
عزت اسمیں ہے شرف اس میں شرافت اسمیں

پیشہ سیکھیں کوئی فن سیکھیں صناعت سیکھیں
کشتکاری کریں آئینِ فلاحت سیکھیں

گھر سے نکلیں کہیں آدابِ سیاحت سیکھیں
الغرض مرد بنیں جرأت و ہمت سیکھیں

کہیں تسلیم کریں جاکے نہ آداب کریں
خود وسیلہ بنیں اور اپنی مدد آپ کریں

انبیا پیشہ پہ گزران سدا کرتے رہے
اولیا خلق کی طاعت سے ابا کرتے رہے

خدمتِ جنس سے نفرت حکما کرتے رہے
حاجتیں آپ ہی سب اپنی روا کرتے رہے

اپنے ہاتھوں سے ہر اک کام نبیڑا اپنا
کھینچ کر لے گئے خود موج سے بیڑا اپنا

کی ہے مردوں نے اسی طرح سے دنیا میں گذر
ہوئی تکلیف سے یا چین سے اوقات بسر

نہ ہوئے غیر کے تا زیست کبھی دست نگر
جب پڑی اپنے ہی بازو پہ پڑی جاکے نظر

گئے دلجمع یہاں سے کہ پریشان گئے
پر زمانے کے نہ شرمندۂ احسان گئے

ہو نکمے حالی سے نہ دنیا میں کہیں ہرزہ سرا
خود ہیں گمراہ مگر قوم کے ہیں راہ نما

جھکتے جھکتے ہوئی پشت آپکی خدمت میں دوتا
اسپہ ہے خیر سے آزادروی کا دعویٰ

بات کہنی وہی زیبا ہے کہ ہو جس میں اثر
ورنہ بے صرفہ نصیحت سے خموشی بہتر

تضییع اوقات

وہ بے مول پونجی کہ ہے اصل دولت
وہ شائستہ ملکوں کا گنج سعادت

وہ آسودہ قوموں کا راس البضاعت ۔۔۔ وہ دولت کہ ہے وقت جس سے عبارت
نہیں اُس کی وقعت نظر میں ہماری
یونہی مفت جاتی ہے برباد ساری

اگر ہم سے مانگے کوئی ایک پیسا ۔۔۔ تو ہوگا کم و بیش بار اس کا دینا
مگر ہاں وہ سرمایہ دین و دنیا ۔۔۔ کہ ایک ایک لمحہ ہے انمول جس کا
نہیں کرتے خِسّت اڑانے میں اُس کے
بہت ہم سخی ہیں لٹانے میں اس کے

اگر سانس دنرات کے سب گنیں ہم ۔۔۔ تو نکلیں گے انفاس ایسے بہت کم
کہ ہو جس میں کل کیلئے کچھ فراہم ۔۔۔ یونہیں گذرے جاتے ہیں دنرات پیہم
نہیں کوئی گویا خبردار ہم میں
کہ یہ سانس آخر ہیں اب کوئی دم میں

گڈرے کا وہ حکم بردار کتا ۔۔۔ کہ بھیڑوں کی ہر دم ہے رکھوال کرتا
جو ریوڑ میں ہوتا ہے پتے کا کھڑکا ۔۔۔ تو وہ شیر کی طرح پھرتا ہے بپھرا
گر انصاف کیجئے تو ہے ہم سے بہتر
کہ غافل نہیں فرض سے اپنے دم بھر

نِعمت

کسی نے یہ اک مرد دانا سے پوچھا ۔۔۔ کہ نعمت ہے دنیا میں سب سے بڑی کیا
کہا "عقل جس سے ملے دین و دنیا ۔۔۔ کہا "گر نہ ہو اس سے انسان کو بہرا

کہا" پھر اہم سب سے علم و ہنر ہے
کہ جو باعثِ افتخارِ بشر ہے

کہا" گر نہ ہو یہ بھی اسکو میسّر"
کہا" مال و دولت ہی پھر سب سے بڑھ کر

کہا" در ہو یہ بھی اگر بند اس پر
کہا، اُسپہ بجلی کا گرنا ہے بہتر

وہ ننگِ بشر تاکہ ذلت سے چھوٹے
خلائق سب اسکی نحوست سے چھوٹے

کاہِل

بنی نوع میں دو طرح کے ہیں انسان
تفاوت ہی حالت میں جن کی نمایاں

کچھ ان میں ہیں راحت طلب اور تن آساں
بدن کے نگہباں بستر کے دربان

نہ محنت پہ مائل نہ قدرت کے قائل
سمجھتے ہیں تنکے کو رستے میں حائل

اگر ہیں تونگر تو بیکار ہیں سب
اپاہج ہیں روگی ہیں بیمار ہیں سب

تعیش کے ہاتھوں سے لاچار ہیں سب
تن آسانیوں میں گرفتار ہیں سب

برابر ہے یاں ان کا ہونا نہ ہونا
نہ کچھ جاگنا ان کا بہتر نہ سونا

اگر ہیں تہدست اور بے نوا وہ
تو محنت سے ہیں جی چراتے سدا وہ

نصیبوں کا کرتے ہیں اکثر گلا وہ
ہلاتے نہیں کچھ مگر دست و پا وہ

اگر بھیک مل جائے قسمت سے اُن کو

تو سو بار بہتر ہے محنت سے ان کو

نہ جو بے نوا ہیں نہ ہیں کچھ تونگر — وہ ہیں ڈھور کی طرح قانع اسی پر
کہ کھانے کو ملتا رہے پیٹ بھر کر — نہیں بڑھتے بس اس سے آگے قدم بھر
ہوئے زیور آدمیت سے عاری
معطل ہوئیں قوتیں ان کی ساری

نہیں کرتے کھیتی میں وہ جانفشانی — نہ ہل جوتتے ہیں نہ دیتے ہیں پانی
پہ جب یاس کرتی ہے دل پر گرانی — تو کہتے ہیں حق کی ہے نا مہربانی
نہیں لیتے کچھ کام تدبیر سے وہ
سدا لڑتے رہتے ہیں تقدیر سے وہ

کبھی کہتے ہیں ہیچ ہیں سب یہ ساماں — کہ خود زندگی ہے کوئی دن کی مہماں
دھرے سب یہ رہ جائینگے کاخ و ایوان — نہ باقی رہیگی حکومت نہ فرماں
ترقی اگر ہم نے کی بھی تو پھر کیا
یہ بازی اگر جیت لی بھی تو پھر کیا

کبھی کہتے ہیں سعی و کوشش سے حاصل — کہ مقسوم بن کوششیں سب ہیں باطل
نہیں ہوتی کوشش سے تقدیر زائل — برابر ہیں یاں محنتی اور کاہل
ہلانے سے روزی کی گر ڈور ہلتی
تو روٹی نکموں کو ہرگز نہ ملتی

نکموں کے ہیں سب یہ دلکش ترانے — سلانے کو قسمت کے رنگین فسانے
اسی طرح کے کر کے حیلے بہانے — نہیں چاہتے دست و بازو ہلانے

وہ بھولے ہوئے ہیں یہ عادت خدا کی
کہ حرکت میں ہوتی ہے برکت خدا کی

جہاں ہو زمیں پر نحوست ہو ان کی
مصیبت کا پیغام شہرت ہے انکی

جدھر ہے زمانہ میں نکبت ہے انکی
تباہی کا لشکر جماعت ہے انکی

وجود ان کا اصل البلیات ہے یاں
خدا کا غضب ان کی ہیہات ہو یاں

جہاں بڑھ گئی ان کی تعداد حد سے
رہا اسکو بہرہ نہ حق کی مدد سے

ہوئی قوم محسوب سب دام و دد سے
وہ اب بچ نہیں سکتی نکبت کی زد سے

بچو ایسے شوموں کی پرچھائیوں سے
ڈرو ایسے چپ چاپ بغمائیوں سے

شمس العلما علامہ شبلی نعمانی

ولادت اعظم گڈھ ۱۸۵۷ء — وفات اعظم گڈھ ۱۹۱۴ء

بربادی خانماں

وہ برادر کہ مرا یوسفِ کنعانی تھا
وہ جو گھر بھر کے لئے رحمت یزدانی تھا

وہ جو مجموعۂ ہر خوبیِ انسانی تھا
قوتِ دست و دلِ شبلی نعمانی تھا

بل اسی کا یہ میرے خامۂ زود میں تھا
جوش اسی کا تھا جو میرے سرِ پرشور میں تھا

ہم سے بیکاروں کی اک قوت بازو تھا وہی — مایۂ عزت اجداد کا حامل تھا وہی
مسند والد مرحوم کے قابل تھا وہی — یوں تو سب اور بھی اعضا ہیں مگر دل تھا وہی

اب وہ مجموعۂ اخلاق کہاں سے لاؤں
ہائے افسوس میں اسحق کہاں سے لاؤں

جب گیا والد مرحوم نے دنیا سے سفر — گھر کا گھر تھا ہدف ناوک صد گونہ خطر
بن گیا آپ اکیلا وہ ہر آفت میں سپر — تیر جو آئے گیا آپ وہ اُن کی زد پر

خود گرفتار رہا تاکہ میں آزاد رہوں
اس نے غم اس لیے کھائے تھے کہ میں شاد رہوں

اس کا صدقہ تھا کہ ہر طرح رہا میں بے غم — گھر کے جھگڑوں سے نہ کچھ فکر نہ کچھ رنج و الم
امن و راحت کے جو سامان تھے ہر طرح بہم — میں تھا اور شغلۂ نامہ و قرطاس بہم

اسکے صدقے سے تھی میری سخن آرائی بھی
اسکا ممنوں تھا مرا گوشۂ تنہائی بھی

تازہ تھا دل پہ ابھی مہدی مرحوم کا داغ — کہ مرا قوت بازو تھا مرا چشم و چراغ
اسکو جنت میں جو خالق نے دیا کنج فراغ — میں یہ کہتا کہ اب بھی ہے ترو تازہ باغ

یعنی وہ آئینۂ خوبی و اخلاق تو ہے
اُٹھ گیا مہدی مرحوم تو اسحق تو ہے

آج افسوس کہ وہ نیر تاباں بھی گیا — میری جمعیت خاطر کا وہ ساماں بھی گیا
اب وہ شیرازۂ اوراق پریشاں بھی گیا — عتبۂ والد مرحوم کا دربان بھی گیا

گلۂ خوبیٔ تقدیر رہا جاتا ہے۔

نوجوان جاتے ہیں اور پیر رہا جاتا ہے

تجھ کو اے خاک لحد آج اجل نے سونپی
بسکہ فطرت میں ودیعت تھی نفاست طلبی
وہ امانت جو مرے والد مرحوم کی تھی
ناز پروردۂ نعمت تھا بایں سادہ وشی

دیکھنا اڑ کے غبار آئے نہ دامن پہ کہیں
گرد پڑ جائے نہ اُس عارض روشن پہ کہیں

اسکے اخلاق کھٹک جاتے ہیں دل میں ہر بار
وہ وفاکیشئ احباب وہ مردانہ شعار
وہ شکر ریز تبسم وہ متانت وہ وقار
وہ دل آویزئ خو وہ نگہہ الفت بار

صحبت رنج بھی اک لطف سے کٹ جاتی تھی
اسکی ابرو پہ شکن آکے پلٹ جاتی تھی

حق نے کی تھی کرم و لطف سے اسکی تخمیر
بات جو کہتا تھا ہوتی تھی وہ پتھر کی لکیر
خوبی خلق و تواضع میں نہ تھا اسکا نظیر
اسکی اک ذات تھی مجموعہ اوصاف کثیر

بسکہ خوش طبع بھی صاحب تدبیر بھی تھا
سچ تو یہ ہے کہ وہ نوخیز تھا اور پیر بھی تھا

اسکو شہرت طلبی سے کبھی کچھ کام نہ تھا
اسکی ہر بات میں اک لطف تھا ابرام نہ تھا
وہ گرفتار کمند ہوس دام نہ تھا
وہ کبھی مدعی رہبری عام نہ تھا

اسکو مطلوب کبھی گرمئ بازار نہ تھی
اسکی جو بات تھی کردار تھی گفتار نہ تھی

اسکو معلوم جو تھا وسعت تعلیم کا راز
اسنے یہ کام نئی طرح کیا تھا آغاز
اسنے دیکھے تھے جو منزل کے نشیب اور فراز
مگر افسوس کہ تھا راہ میں رخش تگ و تاز

کوششوں کے جو نتیجے تھے انہیں مل نہ سکے
ہائے وہ پھول کہ پھولے تھے مگر کھل نہ سکے

آہ بھائی ترے مرنیکے تھے یہ بھی کوئی دن
مسندِ حلقہ احباب ہے سونی تجھ بن!
وہ ترا جوش شباب اور وہ بچے کم سن
تو ہی تھا اب خلفِ صدر نشینان سخن

دن جب آئے کہ تجھے رہبرِ جمہور کہوں
چرخ کا مجھ سے تقاضا ہے کہ مغفور کہوں

یہ بھی اے جانِ برادر کوئی جانیکا ہے طور
ابھی آنے بھی نہ پایا تھا ترے اوج کا دور
اپنے بچوں کی نہ کچھ فکر نہ تدبیر نہ غور
کیا ہوا تجھ کو کہ تو ہو گیا کچھ اور سے اور

چھوڑ کر بچوں کو بے صبر و سکوں جاتا ہے
کوئی جاتا ہے جو دنیا سے تو یوں جاتا ہے

آہ اے مرگ کسی شے کی نہیں تجھ کو تمیز
یہ نہ مانا ترے نزدیک نہ تھا وہ کوئی چیز
تیری نظروں میں برابر ہیں گہر اور پشیز
رحم کرنا تھا کہ چھوڑے ہیں کئی اپنے عزیز

لاڈلے ہیں کہ کسی اور کے بس کے بھی نہیں
اسکے بچے ابھی سات آٹھ برس کے بھی نہیں

اے خدا اشکِ دلِ خستہ بایں موئے سفید
مرنیوالے کو نجاتِ ابدی کی ہو نوید
لیکے آیا ہے تری درگہ عالی میں امید
خوش و خرم رہے چھوٹا مرا بھائی یہ جنید

کیا لکھوں قصہ غم تابِ رقم بھی تو نہیں
اب مرے خامہ پر زور میں دم بھی تو نہیں

رباعیات

رباعی میں چار مصرعے ہوتے ہیں۔ پہلا۔ دوسرا اور چوتھا مصرعہ ہم قافیہ ہونا چاہئے۔ بعض دفعہ چاروں مصرعے بھی ہم قافیہ ہوتے ہیں۔ رباعی کے مضامین عموماً حکیمانہ ہوتے ہیں۔ رباعی کو دوبیتی بھی کہتے ہیں۔

میر ببر علی انیس

اب خواب سے چونک وقت بیداری ہے
مرمر کے پہنچتے ہیں مسافر واں تک
لے زادِ سفر کوچ کی تیاری ہے
یہ قبر کی منزل بھی غضب بھاری ہے

ہموار ہے گر تو کچھ تجھے باک نہیں
پاتا نہیں تند خو کدورت کے سوا
سرکش ہے اگر تو عقل و ادراک نہیں
دامن میں ہو لسکے کچھ بجز خاک نہیں

پرساں کوئی کب جوہر ذاتی کا ہے
شبنم سے جو وجہ گریہ پوچھی تو کہا
ہر گل کو گلہ کم التفاتی کا ہے
رونا فقط اپنی بے ثباتی کا ہے

جس دن کہ فراق روح و تن میں ہوگا
نازاں ہو رختِ نو پہن کر غافل۔
مشکل آنا اس انجمن میں ہوگا
اِک روز یہی جسم کفن میں ہوگا

مر مر کے مسافر نے بسایا ہے تجھے
رخ سب سے پھر کے منہ دکھایا ہو تجھے
کیونکر نہ لپٹ کے تجھ سے سوؤں اے قبر
میں نے بھی تو جان دیکے پایا ہے تجھے

دنیا دریا ہے اور ہوس طوفان ہے
مانندِ حباب ہستیٔ انسان ہے
لنگر ہے جو دل تو ہر نفس بادِ مراد
سینہ کشتی ہے ناخدا ایمان ہے

دنیا میں نہ چین ایک ساعت دیکھا
برسوں نہ کبھی روز فراغت دیکھا
راحت کا مکاں اس کا گھر خانۂ عیش
دیکھا تو جہاں میں کنج عزلت دیکھا

افسوس یہ عصیاں یہ تباہی دل کی
کی خوب انیس خیر خواہی دل کی
کپڑے اجلے پہن کے نازاں ہوئے تم
بڑھتی گئی دن رات سیاہی دل کی

اب گرم خبر موت کے آنے کی ہے
ناداں تجھے فکر آب و دانے کی ہے
ہستی کیلئے ضرور اک دن ہے فنا
آنا تیرا دلیل جانے کی ہے

گلشن میں پھروں کہ سیر صحرا دیکھوں
یا معدن کوہ و دشت و صحرا دیکھوں
ہر جا تری قدرت کے ہیں لاکھوں جلوے
حیران ہوں کہ دو آنکھوں سے کیا کیا دیکھوں

کھینچے ہوئے سر کو تو کہاں پھرتا ہے
پیری میں بشکلِ نوجواں پھرتا ہے
عرصہ ہے جہاں کا اس قدر تنگ و حقیر
خم ہو کے زمیں پہ آسماں پھرتا ہے

انساں ہی کچھ اس دور میں پامال نہیں
سچ ہے کوئی آسودہ و خوشحال نہیں
اندیشۂ آشیان و خوفِ صیاد
مرغانِ چمن بھی فارغ البال نہیں

ماں باپ سے بھی سوا ہے شفقت تیری
افزوں ہے ترے غضب سے رحمت تیری

جنت انعام کر کہ دوزخ میں جلا
وہ رحم ترا ہے یہ عدالت تیری

گو صورت دریا ہمہ تن جوش ہوں میں
لب خشک ہیں چشم تر ہے خاموش ہوں میں
کیا پوچھتے ہو مقام و مسکن میرا
مانند حباب خانہ بر دوش ہوں میں

وہ موج حوادث کا تھپیڑا نہ رہا
کشتی وہ ہوئی غرق وہ بیڑا نہ رہا
سارے جھگڑے تھے زندگانی کے انیس
جب ہم نہ رہے تو کچھ بکھیڑا نہ رہا

رتبہ جسے دیتا ہے خدا دیتا ہے
وہ دل میں فروتنی کو جا دیتا ہے
کرتے ہیں تہی مغز ثنا آپ اپنی
جو ظرف کہ خالی ہے صدا دیتا ہے

گلشن میں صبا کو جستجو تیری ہے
بلبل کی زباں پہ گفتگو تیری ہے
ہر رنگ میں جلوہ ہے تری قدرت کا
جس پھول کو سونگھتا ہوں بو تیری ہے

کیا سوچ کے اس دار فنا میں آئے
آفت میں پھنسے دام بلا میں آئے
اس طرح عدم سے آئے دنیا میں انیس
جیسے کوئی کارواں سرا میں آئے

افسوس جہاں سے دوست کیا کیا نہ گئے
اس باغ سے کیا کیا گل رعنا نہ گئے
تھا کونسا نخل جس نے دیکھی نہ خزاں
وہ کون سے گل کھلے جو مرجھا نہ گئے

مرزا اسد اللہ خاں غالب

دکھ جی کے پسند ہو گیا ہے غالب
دل رک رک کے بند ہو گیا ہے غالب
واللہ کہ شب کو نیند آتی ہی نہیں
سونا سوگند ہو گیا ہے غالب

مشکل ہے زبس کلام میرا اے دل
سن سن کے سخنوران کامل
آسان کہنے کی کرتے ہیں فرمائش
گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل

بھیجی ہے جو مجکو شاہ جمجاہ نے دال
ہے لطف و عنایات شہنشاہ پہ دال
یہ شاہ پسند دال بے بحث و جدال
ہے دولت و دین و دانش و داد کی دال

حق شہ کی بقا سے خلق کو شاد کرے
تا شاہ شیوع دانش و داد کرے
یہ دی جو گئی ہے رشتۂ عمر میں گانٹھ
ہے صفر کہ افزائش اعداد کرے

اس رشتہ میں لاکھ تار ہوں بلکہ سوا
اتنے ہی برس شمار ہوں بلکہ سوا
ہر سیکڑہ کو ایک گرہ فرض کریں
ایسی گرہیں ہزار ہوں بلکہ سوا

کہتے ہیں کہ اب وہ مردم آزار نہیں
عشاق کی پرسش سے اسے عار نہیں
جو ہاتھ کہ ظلم سے اٹھایا ہوگا
کیونکر مانوں کہ اس میں تلوار نہیں

ہم گرچہ بنے سلام کرنے والے
کرتے ہیں درنگ کام کرنیوالے
کہتے ہیں کہیں خدا سے اللہ اللہ
وہ آپ ہیں صبح و شام کرنیوالے

سامان خور و خواب کہاں سے لاؤں
آرام کے اسباب کہاں سے لاؤں
روزہ مرا ایمان ہے غالب لیکن
خس خانہ و برفاب کہاں سے لاؤں

ان سیم کے بیجوں کو کوئی کیا جانے
بھیجے ہیں جو ارمغان شہ والا نے
گن کر دیوینگے ہم دعائیں سو بار
فیروزہ کی تسبیح کے ہیں یہ دانے

شیخ محمد ابراہیم ذوق

کیا فائدہ فکر بیش و کم سے ہوگا
ہم کیا ہیں جو کوئی کام ہم سے ہوگا
جو کچھ کہ ہوا ہوا کرم سے تیرے
جو کچھ ہوگا ترے کرم سے ہوگا

اے ذوق کبھی تو نہ خوش اوقات ہوا
اکدم نہ ترا صرف مناجات ہوا
جبتک تھا جوان تھا جوانِ بدمست
اب پیر ہوا - پیر خرابات ہوا

جبتک تھے گرم ہیں احمقوں کے پیسے
سب کہتے تھے انکو آپ ایسے ایسے
مفلس جو ہوئے تو پھر کسی نے اے ذوق
پوچھا نہ کہ تھے وہ کون ایسے تیسے

دنیا کے الم ذوق اٹھا جائیں گے
ہم کیا کہیں کیا آئے تھے کیا جائینگے
جب آئے تھے روتے ہوئے آپ آئے تھے
اب جائینگے اوروں کو رلا جائینگے

اس جہل کا ہے ذوق ٹھکانہ کچھ بھی
دانش نے کیا دل کو نہ دانا کچھ بھی
ہم جانتے تھے علم سے کچھ جانیں گے
جانا تو یہ جانا کہ نہ جانا کچھ بھی

شمس العلما خواجہ الطاف حسین حالی

کانٹا ہے ہر اک جگر میں اٹکا تیرا
حلقہ ہے ہر اک گوش میں لٹکا تیرا
مانا نہیں جس نے تجھکو جانا ہے ضرور
بھٹکے ہوئے دلمیں بھی ہے کھٹکا تیرا

طوفان میں ہو جب جہاز چکر کھاتا
جب قافلہ وادی میں ہے سر ٹکراتا

اسباب کا آسرا ہے جب اُٹھ جاتا
واں تیرے سوا کوئی نہیں یاد آتا

ہندو سے لڑیں نہ گبر سے بیر کریں
شر سے بچیں اور شر کے عوض خیر کریں
جو کہتے ہیں یہ کہ ہے جہنم دنیا
وہ آئیں اور بہشت کی سیر کریں

بلبل کی چمن میں ہمزبانی چھوڑی
بزمِ شعرا میں شعرخوانی چھوڑی
جب سے دلِ زندہ تو نے ہم کو چھوڑا
ہم نے بھی تری رام کہانی چھوڑی

خوش رہتے ہیں وہ کہیں کامرانوں کیطرح
ہیں ضعف سے لڑتے پہلوانوں کی طرح
دل انکے ہیں ظرف انکے جو کرتے ہیں تیر
ہنس بول کے پیری کو جوانوں کی طرح

نیکوں کو نہ ٹھہرائیو بد لے فرزند
اِک آدھ ادا اُن کی اگر ہو نہ پسند
کچھ نقص انار کی لطافت میں نہیں
ہوں اس میں اگر گلے سڑے دانے چند

تا زیست وہ محوِ نقشِ موہوم رہے
جو طالبِ دوستانِ معصوم رہے
اصحاب سے بات بات پر جو بگڑے
صحبت کی وہ برکتوں سے محروم رہے

ممکن نہیں یہ کہ ہو بشر عیب سے دور
پر عیب سے بچیے تا بمقدور ضرور
عیب اپنے گھٹاؤ پر خبردار رہو
گھٹنے سے کہیں انکے نہ بڑھ جائے غرور

جو کرتے ہیں کچھ زبان سے کہتے ہیں وہ کم
ہوتے نہیں ساتھ جمع دم اور قدم
بڑھتا گیا جس قدر کہ حسنِ گفتار
بس اتنے ہی گھٹتے گئے کردار میں ہم

ہیں جہل میں سب عالم و جاہل ہمسر
آتا نہیں فرق اسکے سوا ان میں نظر
عالم کو ہے علم اپنی نادانی کا
جاہل کو نہیں جہل کی کچھ اپنے خبر

اک منعم مسرف نے یہ عابد سے کہا
کر میرے لئے حق سے فراغت کی دعا
عابد نے کہا یہ ہاتھ اٹھا کر سوئے چرخ
محتاج کر اسکو جلد اے بار خدا

بس بس کے ہزاروں گھر اجڑ جاتے ہیں
گڑ گڑ کے علم لاکھوں اکھڑ جاتے ہیں
آج اسکی ہے نوبت تو کل اسکی باری
بن بن کے یونہی کھیل بگڑ جاتے ہیں

ہر بزم میں آفریں کے لایق ہونا
شیریں سخنی میں شہد فائق ہونا
ممکن نہیں جبتک کہ نہو دلمیں نفاق
آساں نہیں مقبول خلائق ہونا

حالی رہ راست جو کہ چلتے ہیں سدا
خطرہ انہیں گرگ کا نہ ڈر شیروں کا
لیکن ان بھیڑیوں سے واجب ہے حذر
بھیڑوں کے لباس میں ہیں جو جلوہ نما

اے علم کیا ہے تو نے ملکوں کو نہال
غائب ہوا تو جہاں سے واں آیا زوال
اُن پر ہوئے غیب کے خزانے مفتوح
جن قوموں نے ٹھہرایا تجھے راس المال

بیٹا نکلے نہ جب تلک ذلت سے
عزت نہیں اسکو باپ کی عزت سے
سوچو تو ہے کھات کا نسب بھی عالی
پر اسکو شرف نہیں کچھ اس نسبت سے

دولت نے کہا مجھ سے ہے عزت جہاں
فرمایا ہنر نے میں ہوں عزت کا نشاں
عزت بولی غلط ہے دونوں کا بیاں
میں بھید ہوں حق کا جو ہے نیکی میں عیاں

عشرت کا ثمر تلخ سدا ہوتا ہے
ہر قہقہہ پیغامِ بکا ہوتا ہے
جس قوم کو عیش دوست پاتا ہوں میں
کہتا ہوں کہ اب دیکھئے کیا ہوتا ہے

رونق ہے ہر اک بزم کی اب غیبت میں
بدگوئی خلق ہے ہر اک صحبت میں

اوروں کی برائی ہی پہ ہے فخر وہاں
خوبی کوئی باقی نہیں جس امت میں

فتنہ کو جہاں تلک ہو دیجے تسکین
زہر اگلے کوئی تو کیجے باتیں شیریں
غصہ غصے کو اور بھڑکاتا ہے
اس عارضہ کا علاج بالمثل نہیں

تیمور نے اک مورچہ زیر دیوار
دیکھا کہ چڑھا دانے کو لیکر سو بار
آخر سر بام لیکے پہنچا تو کہا
مشکل نہیں کوئی پیش ہمت دشوار

اک مرد توانا کو جو سائل پایا
کی میں نے ملامت اور بہت شرمایا
بولا کہ ہے اس کا ان کی گردن پہ وبال
دے دے کے جنہوں نے مانگنا سکھلایا

اشراف نہ بس اپنے حق میں کانٹے بوئیں
نعمت نہ خدا کی رائگاں یوں کھوئیں
گر بخل پہ لوگ انکے ہنسیں بہتر ہے
اس سے کہ فضولیوں پہ انکی روئیں

خان بہادر سید اکبر حسین اکبر الہ آبادی

کھولی ہے زبان خوش بیانی کیلئے
اُٹھا ہے قلم گہر فشانی کیلئے
آیا ہوں میں کوچہ سخن میں اکبر
نظارہ شاہد معانی کیلئے

کیا تم سے کہیں جہاں کو کیسا پایا
غفلت ہی میں آدمی کو ڈوبا پایا
آنکھیں تو بے شمار دیکھیں لیکن
کم تھیں بخدا کہ جنکو بینا پایا

اونچا نیت کا اپنی زینہ رکھنا
احباب سے صاف اپنا سینہ رکھنا
غصہ آنا تو نیچرل ہے اکبر
لیکن ہے شدید عیب کینہ رکھنا

غفلت کی ہنسی سے آہ بھرنا اچھا
افعال مضر سے کچھ نہ کرنا اچھا
اکبرؔ نے سنا ہے اہل غیرت سے یہی
جینا ذلت سے ہو تو مرنا اچھا

کہنے کو تو شاہ سب ہیں مہراج ہیں سب
مالک دولت کے مالکِ تاج ہیں سب
لیکن کھولو جو چشمِ تحقیق اکبرؔ
بے بس ہیں سب خدا کے محتاج ہیں سب

پیری آئی ہوئی جوانی رخصت
ساتھ اسکے وہ لطفِ زندگانی رخصت
ہے اب تو اسی کا انتظار اے اکبرؔ
ہمکو بھی کرے جہانِ فانی رخصت

ہو علم اگر نصیب تعلیم بھی کر
دولت جو ملے تو اسکو تقسیم بھی کر
اللہ عطا کرے جو عظمت تجھ کو
جو اہل ہیں اسکے انکی تعظیم بھی کر

گر جیب میں زر نہیں تو راحت بھی نہیں
بازو میں سکت نہیں تو عزت بھی نہیں
گر علم نہیں تو زور و زر ہے بے کار
مذہب جو نہیں تو آدمیت بھی نہیں

دنیا سے میل کی ضرورت ہی نہیں
مجھ کو اس کھیل کی ضرورت ہی نہیں
درپیش ہے منزل عدم اے اکبرؔ
اس راہ میں ریل کی ضرورت ہی نہیں

خاطر مضبوط دل توانا رکھو
امید اچھی خیال اچھا رکھو
ہو جائینگی مشکلیں تمہاری آساں
اکبرؔ اللہ پر بھروسا رکھو

اعمال کے حسن سے سنورنا سیکھو
اللہ سے نیک امید کرنا سیکھو
مرنے سے مفر نہیں ہے جب اے اکبرؔ
بہتر ہے یہی خوشی سے مرنا سیکھو

حاصل کرو علم طبع کو تیز کرو
باتیں جو بری ہیں انسے پرہیز کرو

قومی عزت ہے نیکیوں سے اکبر	اسمیں کیا ہی کہ نقل انگریز کرو
ہوتی ہی نصیب تلخ کامی تم کو اغیار نہیں بنا سکے تم کو غلام	محسوس نہیں ہے اپنی خامی تم کو ہے اپنے ہی نفس کی غلامی تم کو

مخمس

نظم کی وہ قسم ہے جس میں پانچ مصرعے کا ایک بند ہوتا ہو ہر بند کا پانچواں مصرعہ پہلے بند کے پانچویں مصرعے کے قافیہ پر ہوتا ہے۔ ایسا بھی ہوتا ہے کہ پہلے بند کے آخری مصرعے کی ہر بند میں تکرار کرتے ہیں۔

مرزا محمد رفیع سودا

ولادت دہلی ۱۱۲۵ھ　　وفات لکھنؤ ۱۱۹۵ھ

شہر آشوب

کہا میں آج یہ سودا سے کیوں تو ڈانوا ڈول لگا وہ کہنے یہ اسکے جواب میں دو بول	پھرے ہی جا کہیں نوکر ہو لے کے گھوڑا مول جو میں کہونگا تو سمجھے کا تو کہ یہ ہی ٹھٹھول
بتا کہ نوکری بکتی ہے ڈھیریوں یا مول	

سپاہی رکھتے تھے نوکر امیر و دولتمند
سو آمد اُن کی تو جاگیر سے ہوئی ہی بند
کیا ہی ملک کو مدت سے سرکشوں نے پسند
جو ایک شخص ہے بائیس صوبہ کا خاوند
رہی نہ اُسکے تصرف میں فوجدارئے کول

قوی ہیں ملک میں مفسد امیر ہیں سو ضعیف
ٹکے کہاں جو ہمیں دے کے ہوں انھوں سے حریف
نہ کچھ ربیع میں حاصل نہ درمیان خریف
جو عامل اب ہیں محالات پر سو یوں ہیں ضعیف
کہ جس طرح کسی حاکم کے گھر گنوار ہو اول

امیر اب جو ہیں وہ انا انہو نکی ہی یہ چال
ہوئے ہیں خانہ نشین دیکھ کر زمانہ کا حال
بچھی ہی سوزنی خوجہ کھڑا اچھلے ہی رومال
حضور بیٹھے ہیں اک دو ندیم اہلِ کمال
دھری ہی سامنے اک پیکدان و اک تنبول

جو کوئی ملنے کو آنکے انہوں کے گھر آیا
ملے یہ اُس سے گر اپنا دماغ خوش پایا
جو ذکر سلطنت اس میں وہ درمیان لایا
انھوں نے پھیر کے اُدھر سے منہ یہ فرمایا
خدا کے واسطے بھائی کچھ اور باتیں بول

جو اصطبل میں کئی گھوڑے ہیں سو کیا امکان
کہ ہوئے گھاس سے مٹھے کا انکے آگے نشان
کسی کی لوٹی ہی ٹنگڑی کسیکا جھڑ گیا کان
طویلہ اسکو کہوں یا میں رنج پیر کا تھان
اسی خیال میں رہتی ہے عقل ڈانوا ڈول

اور اب جو زعم میں آقا کے فیل خانا ہی
جو ہتھنی اندھی ہی اسمیں تو ہاتھی کا نام ہی
نہ ٹھور چارہ کا راتب کا نے ٹھکانا ہے
ہر ایک بھوک سے سوئے عدم روانا ہی
اب اسکو خواہ وہ پایل سمجھ لیں خواہ نجھول

کرے ہی بھوک سی شاگرد پیشہ اب معائش
کہیں پلاؤ تو باورچی واں پکاویں آش

کریں قناتوں میں دربان بیٹھے پردہ فاش　　تلے سے کھینچ لے مسند کو آن کر فراش

اگر کہیں کہ مٹا اٹھ کے چاندنی کا جھول

وہ نوکر اب جسے آقا ہر آن پہچانے　　جو پوچھو اُس سے کہ تم کچھ رُپے لگے پانے
کہے ہے آہ وہ بھر کر سوائے آٹھ آنے　　رُپے کی شکل نہیں دیکھی ہے خدا جانے

کہ اس زمانہ میں چپٹا بنے ہے وہ یا گول

خراب ہیں وہ عمارات کیا کہوں تجھ پاس　　کہ جسکے دیکھے سے جاتی رہی تھی بھوک اور پیاس
اور اب جو دیکھو تو دل ہووے زندگی سے اُداس　　بجائے گل چمنوں میں کمر کمر ہے گھاس

کہیں ستون پڑا ہے کہیں پڑے مرغول

جہاں آباد تو کب اس ستم کے قابل تھا　　مگر کبھی کسی عاشق کا یہ نگر دل تھا
کہ یوں اٹھا دیا گویا کہ نقش باطل تھا　　عجب طرح کا یہ بحر جہاں میں ساحل تھا

کہ جس کی خاک سے لیتی تھی خلق موتی رول

غرض میں کیا کہوں یارو کہ دیکھکر یہ قہر　　کروڑ مرتبہ خاطر میں گذرے ہے یہ لہر
جو ٹک بھی امن دل اپنے کو دیوے گردش دہر　　تو بیٹھ کر کہیں یہ رویئے کہ مردم شہر

گھروں سے پانی کو باہر کریں جھکول جھکول

بس اب خموش ہو سودا کہ آگے تاب نہیں　　وہ دل نہیں کہ اب اس غم سے جو کباب نہیں
کسی کی چشم نہ ہوگی کہ وہ پر آب نہیں　　سوائے اسکے تری بات کا جواب نہیں

کہ یہ زمانہ ہے اک طرح کا زیادہ نہ بول

میاں ولی محمد نظیر اکبر آبادی

ولادت آگرہ سنہ ۱۷۳۹ء　　　وفات آگرہ سنہ ۱۸۳۰ء

مفلسی

جب آدمی کے حال پہ آتی ہے مفلسی
کس کس طرح سے اسکو ستاتی ہے مفلسی
پیاسا تمام روز بٹھاتی ہے مفلسی
بھوکا تمام رات سلاتی ہے مفلسی
یہ دکھ وہ جانے جسپہ کہ آتی ہے مفلسی

کہئے تو اب حکیم کی سب سے بڑی ہے شاں
تعظیم جس کی کرتے ہیں نواب و رخاں
مفلس ہوئے تو حضرت لقمان کیا ہیں یاں
عیسیٰ بھی ہو تو کوئی نہیں پوچھتا میاں
حکمت حکیم کی بھی ڈوباتی ہے مفلسی

جو اہل فضل عالم و فاضل کہاتے ہیں
مفلس ہوئے تو کلمہ تلک بھول جاتے ہیں
پوچھے کوئی الف تو اسے بے بتاتے ہیں
وہ جو غریب غربا کے لڑکے پڑھاتے ہیں
انکی تو عمر بھر نہیں جاتی ہے مفلسی

مفلس کرے جو آن کے مجلس کے بیچ حال
سب جانیں رنڈیوں کا یہ ڈالا ہے اس نے جال
گر گر پڑے تو کوئی نہ لیوے اسے سنبھال
مفلس میں ہو وے لاکھ اگر علم اور کمال
سب خاک بیچ آ کے ملاتی ہے مفلسی

جب روٹیوں کے بٹنے کا آ کر پڑے شمار
گر اور مانگے وہ تو اسے جھڑکیں بار بار
مفلس کو دیویں ایک تو نگر کو چار چار
اس مفلسی کا آہ بیاں کیا کروں میں یار
مفلسی کو اس جگہ بھی چباتی ہے مفلسی

لازم ہے گر غمی میں کوئی شور و غل مچائے
مرجائے گر کوئی تو کہاں سے اسے اٹھائے
مفلس بغیر غم کے ہی کرتا ہے ہائے ہائے
اس مفلسی کی خواریاں کیا کیا کہوں میں ہائے
مردے کو بن کفن کے گڑاتی ہے مفلسی

بی بی کو نتھ نہ لڑکوں کے ہاتھوں کڑے رہے
جب کڑیاں بک گئیں تو کھنڈر میں اٹے رہے
کپڑے میاں کے بنئے کے گھر میں پڑے رہے
زنجیر نے کواڑ نہ پتھر گڑے رہے
آخر کو اینٹ اینٹ کھداتی ہے مفلسی

رکھتی نہیں کسیکی یہ عزت کی آن کو
سو محنتوں میں اسکی کھپاتی ہے جان کو
سب خاک میں ملاتی ہے حرمت کی شان کو
چوری پہ آکے ڈالے ہے مفلس کے دھیان کو
آخر نداں بھیک منگاتی ہے مفلسی

دنیا میں لیکے شاہ سے اے یار تا فقیر
اشراف کو بناتی ہے اک آن میں فقیر
خالق نہ مفلسی میں کسیکو کرے اسیر
کیا کیا میں مفلسی کی خرابی کہوں نظیر
وہ جانے جس کے دل کو جلاتی ہے مفلسی

برسات کی بہار

کتنوں کو محلوں اندر ہے عیش کا نظارہ
کرتا ہے سیر کوئی کوٹھے کا لے سہارا
یا سائبان ستھرا یا بانس کا اُسارا
مفلس بھی کر رہا ہے پولے تلے گذارا

کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

مدت سے ہو رہا ہے جن کا مکان پرانا
اُٹھ کے ہیں ان کو مینہ میں ہر آن چھت پہ جانا
کوئی پکارتا ہے ٹک موری کھول آنا
کوئی کہے ہے چل بھی کیوں ہو گیا دوانا

کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

کوئی پکارتا ہے لو یہ مکان ٹپکا
گرتی ہے چھت کی مٹی اور سائبان ٹپکا
چھلنی ہوئی اٹاری کوٹھا ندان ٹپکا
باقی تھا اک اُساڑا سو وہ بھی آن ٹپکا

کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

چھت گرنے کا کسی جا غل شور ہو رہا ہے
دیوار کا بھی دھڑکا کچھ ہوش کھو رہا ہے
در در حویلی والا ہر آن رو رہا ہے
مفلس سو جھونپڑے میں دل شاد سو رہا ہے

کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

ہے جن کنے مہیا پکا پکایا کھانا
انکو پلنگ پہ بیٹھے جھڑیوں کا حظ اٹھانا
ہے جنکو اپنے گھر میں یاں نون تیل لانا
ہے اُنکے سر پہ پنکھا یا چھاجھ ہے پرانا

کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

جو اس ہوا میں یارو دولت میں کچھ بڑے ہیں
ہے انکے سر پہ چھتری ہاتھی اوپر چڑھے ہیں
ہم سے غریب غربا کیچڑ میں گر پڑے ہیں
ہاتھوں میں جوتیاں ہیں اور پائنچے چڑھے ہیں

کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

کیچڑ سے ہو رہی ہے جس جا زمیں پھسلنی
مشکل ہوئی ہے واں سے ہر اک کو راہ چلنی
پھسلا جو پاؤں پگڑی مشکل ہے پھر سنبھلنی
جوتی پھنسی تو واں سے کیا تاب پھر نکلنی

کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

کتنے تو کیچڑوں کے دلدل میں پھنس رہے ہیں
کپڑے تمام گندی دلدل میں بس رہے ہیں
کتنے اٹھے ہیں مر مر کتنے اکس رہے ہیں
وہ دکھ میں پھنس رہے ہیں اور لوگ ہنس رہے ہیں
کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

مولوی محمد حسین آزاد

اولوالعزمی

ہے سامنے کھلا ہوا میداں چلے چلو
باغ مراد ہے ثمر افشاں چلے چلو
دریا ہو بیچ میں کہ بیاباں چلے چلو
ہمت یہ کہہ رہی ہے کھڑی ہاں چلے چلو
چلنا ہی مصلحت ہے مری جاں چلے چلو

ہیں کوہ و دشت ایسے کہ پھولا پھلا چمن
دامن میں ہیں بھرے ہوئے نسرین و نسترن
نہریں اِدھر اُدھر ہیں امیدوں کی موجزن
اس دشت میں نہ دوڑ سکو بنکے گر ہرن
کبکِ دری کی طرح خراماں چلے چلو

آؤ کہ کھو دے اپنے نشاں ننگ و نام نے
باندھی کمر ہے کس کے ہر اک شاد کام نے
کیوں اس طرح کمر کو لگے تھک کے تھامنے
دیوارِ باغ وہ نظر آتی ہے سامنے
سروِ سہی کے سر ہیں نمایاں چلے چلو

یارو چلو چلو نہ کرو انتظار تم
کرتے ہو کیا امید یمیں و یسار تم
میدانِ عزم و جزم کے ہو شہسوار تم
بڑھ جاؤ گے کرو گے اگر مار مار تم
چلا رہی ہے ہمتِ مرداں چلے چلو

ہمت کے شہ سوار جو گھوڑے اٹھائینگے
دشمن فلک بھی ہونگے تو سر کو جھکائینگے

طوفان بلبلوں کی طرح بیٹھ جائینگے
نیکی کے زور اٹھ کے بدی کو دبائینگے

بیٹھو نہ تم مگر کسی عنوان چلے چلو

آئینہ دل کا گرد سفر سے اُجال دو
پوچھے کوئی ارادہ کدھر ہے تو ٹال دو

شیطاں جو شبہ ڈالے تو دل سے نکال دو
ہو خوف کا خیال تو بزدل پہ ٹال دو

اور آپ بن کے شیر نیستان چلے چلو

رکھو رفاہ قوم پر اپنا مدار تم
اور ہو کبھی صلے کے نہ امیدوار تم

عزت خدا جو دیوے تو پھر کیوں ہو خوار تم
دو رُخ کو آب فخر سے رنگ بہار تم

گلشن میں ہو کے باد بہاراں چلے چلو

آدسیہ سفید کا فیصل حساب ہے
چمکا یا چہرہ صبح نے با آب و تاب ہے،

ظلمت پہ نور ہونے لگا فتحیاب ہے
اور شب کے پیچھے تیغ بکف آفتاب ہے،

تم بھی ہو آفتاب درخشاں چلے چلو

منشی تلوک چند محروم

خدا کے جلوے

بتاؤ مہر منور میں نور کس کا ہے
میان انجم تاباں ظہور کس کا ہے

یہ تجھ میں اے دل شاعر سرور کس کا ہے
دماغ فلسفی تجھ میں شعور کس کا ہے

یہ سارے جلوے ہیں کس کے خدا کے جلوے ہیں

وہی ہے رعد میں بجلی میں اور بادل میں
اُسی کی بو ہے گلوں میں اسی کا رس پھل میں

اسی کے دم سے ہے منگل ہر ایک جنگل میں
اُسی کی نکہت تر ہے صبا کے آنچل میں

یہ سارے جلوے ہیں کس کے خدا کے جلوے ہیں

ہر ایک برگ چمن اُسکا ہے پتہ دیتا
ہر ایک سرو جو انگلی ہے یوں اُٹھا دیتا

جو گل سے پوچھو تو وہ بھی ہے مسکرا دیتا
نشان اُسکا ہمیں ہے یہ برملا دیتا

یہ سارے جلوے ہیں کس کے خدا کے جلوے ہیں

چمن میں دشت میں وادی میں کوہ و صحرا میں
شرر میں شعلے میں آتش میں برق سینا میں

کہیں ہیں اولے میں شبنم میں ابر و دریا میں
شمیم گل میں نسیم مسرت افزا میں

یہ سارے جلوے ہیں کس کے خدا کے جلوے ہیں

اُسی کے جلوے ہیں سارے جو چشم بینا ہو
وہ روبرو ہے ہمارے جو چشم بینا ہو

تمام ذرے ہیں تارے جو چشم بینا ہو
بشر زباں سے پکارے جو یہ چشم بینا ہو

یہ سارے جلوے ہیں کس کے خدا کے جلوے ہیں

امانت خدا

مجنوں کا دل ہے خواہش لیلےٰ کیواسطے
بلبل کا دل بنا گلِ رعنا کیواسطے

وامق کا دل ہے دامنِ عذرا کیواسطے
پھر دل مرا ہے کسکی تمنا کیواسطے

یہ دل مرا نہیں ہے امانت خدا کی ہے

پنہاں اسی میں راز ہیں کچھ راز دار کے
دامن میں پھول کچھ ہیں کہیں کی بہار کے

لایا تھا ساتھ عرش بریں سے اتار کے
پہلو میں کچھ ہیں داغ کسی لالہ زار کے

یہ دل مرا نہیں ہے امانت خدا کی ہے

او قاصد شباب نہ لانا پیام عشق
ہو جاؤں یوں تو جان سے دل سے غلام عشق

چھاتی دہل گئی ہے یہاں سنکے نام عشق
ممکن ہے بھول جاؤں کبھی پی کے جام عشق

یہ دل مرا نہیں ہے امانت خدا کی ہے

او حسن فتنہ ساز تجھے دیکھتا تو ہوں
بہتر ہے عشووں سے ترے نا آشنا رہوں

ہے مثل سحر سامری بیشک ترا فسوں
تو لاکھ عشوہ بانہ ہو پر دل تجھے نہ دوں

یہ دل مرا نہیں ہے امانت خدا کی ہے

صیاد نقش طائر دل سے ذرا پرے
دانا ہے کب فریب میں آتا ہی جا مرے

کمبخت اپنے جال کو جا کر بچھا پرے
مکار جا کے مکر کے دانے گرا پرے

یہ دل مرا نہیں ہے امانت خدا کی ہے

کتنے ہی اسکے چاہنے والے ہیں خاک میں
ملجائے آہ آہ مرا دل نہ خاک میں

دم کر رکھا ہے نفس ستمگر نے ناک میں
کیا چیز لیکے جاؤنگا درگاہ پاک میں

یہ دل مرا نہیں ہے امانت خدا کی ہے

ترکیب بند

اس نظم کو کہتے ہیں جس میں غزل کے طور پر مع مطلع کے چند
اشعار کہتے ہیں اور پھر ایک مطلع دوسرے قافیہ میں کہکر
اُس سے ملحق کر دیتے ہیں یہ ایک بند ہوا۔ پھر دوسرے

بند میں دوسری غزل دوسرے قافیہ میں لیکن بند اول
ہی کے وزن پر کہتے ہیں ۔ اور اسکے بعد بھی ایک مطلع
دوسرے قافیہ میں شامل کرتے ہیں اسی طرح کے متعدد
بند ہوتے ہیں ۔

شمس العلما خواجہ الطاف حسین حالی

ہندوستان

اے حصارِ عافیت اے کشورِ ہندوستاں
زیب دیتا ہے اگر کہیے تجھے سارا جہاں

اِک طرف کھینچی ہے قدرت نے ترے دیوار کوہ
موجزن ہے ایک جانب ترے بحر بیکراں

چوٹیوں پر ہے پہاڑوں کی وہ عالم برف کا
ہے سدا چھایا ہوا جس پر خموشی کا سماں

بحر میں ہوتا ہے اک شورِ قیامت آشکار
جب کہ آہیں آکے گرتی ہیں ہزاروں ندیاں

خوف باہر کا ہے تجھکو اور نہ کچھ اندر کی فکر
دستِ گلچیں نارسا و نخل دولت گلفشاں

تو نے فارغ کر دیا ہے فتح ملک غیر سے
پھر ضرورت کیا کہ کھولیں بے سبب تیغ نشاں

چل رہی ہے امن کی ہر سو ہوائے خوشگوار
ہو نہ اب کہدو خزاں سے رخنہ انداز بہار

اے مقدس آریہ ورت آئی کیا تجھ پر بلا
جس نے برہم یک دلی کو تیری برہم کر دیا

کوچ کر جاتا نہ تجھ سے گر وفاق و اتحاد
کون تھا جو تیری جانب آنکھ اٹھا کر دیکھتا

تو کہاں اور اہلِ مغرب کے بھلا حملے کہاں
ہاں مگر نا اتفاقی کی ملی تجھ کو سزا

گر تری اولاد میں ہوتا سلوک و آشتی
گھاٹیوں میں آکے جب ہوتی فراہم تیری فوج
بھاگنا بھی دشمنوں کو واں سے ہو جاتا محال
لڑکھڑا جاتے قدم غیروں کے ہنگام وغا
ہوش کھو دیتی سُمِ اسپانِ ہندی کی صدا
دیکھتے جب ہر طرف سے آمدِ سیلِ بلا

یا اطاعت کرتے اور لڑنے سے باز آتے وہیں
یا اگر کرتے بہت ہمت تو مر جاتے وہیں

ہند کا حق تھا کہ ہوتی مہر و الفت کی زمیں
حیف جس مٹی سے اُگنا چاہیئے تھا نخلِ مہر
سر بسر تختے گلِ خود رو کے جس جنگل میں تھے
امن قایم تھا طلوعِ صبح کے آغاز میں
دیوتا جو آریا کے زعم میں فانی نہ تھے
جنگ و خونریزی کے خود آکر ہوئے وہ رہنما
قوم کے ہمدرد ہوتے اس مکاں کے سب مکیں
جم گیا آب و ہوائے دہر سے واں نخلِ کیں
غور سے دیکھا تو پنہاں تھے درندے بھی وہیں
جتنا دن چڑھتا گیا ہوتا گیا عزلت گزیں
فانیوں کی طرح یا آکر رہے وہ بالیقین
ورنہ فتنے کا قدم تک یاں نہ آیا تھا کہیں

یک بیک آیا خلل امن و اماں میں ہر طرف
اک تنزل پڑ گیا ہندوستان میں ہر طرف

علم کی ضرورت

گیا دورِ حکومت کا بس اب حکمت کی باری
جنھیں دنیا میں رہنا ہے رہیں معلوم یہ اُن کو
ضرورت علم و دانش کی ہے ہر فن اور صنعت میں
جہاں میں چار سو علم و عمل کی ہے عملداری
کہ ہیں اب جہل و نادانی کے معنی ذلت و خواری
نہ چل سکتی ہے اب بے علم نجاری نہ سناری

جہاں علم تجارت میں نہ ماہر ہونگے سوداگر — تجارت کی نہ ہو گی تا قیامت گرم بازاری
نہ آئینگی پسند ان نوکروں کی خدمت و طاعت — جنہیں پائیں گے آقا زیور تعلیم سے عاری
اگر چاہیں گے کرنی آدمی گھوڑوں کی سائیسی — تو دینا ہوگا ان کو امتحان علم بیطاری
نہ مستغنی بکاول علم سے اب ہیں نہ باورچی — ہوا ہے مدرسوں سے مطبخوں تک فلسفہ جاری
یقیں جانو کہ آئندہ ملیگی درسگاہوں میں — اگر آٹا پیسنے کو چاہیئے ہو گی پسنہاری
کوئی پیشہ نہیں اب معتبر بے تربیت ہرگز — نہ فصادی نہ جراحی نہ کحالی نہ عطاری

جہاں تک دیکھیے تعلیم کی فرماں روائی ہے
جو سچ پوچھو تو نیچے علم ہے اوپر خدائی ہے

گئے وہ دن کہ تھا علم و ہنر انسان کا زیور — ہوئی ہے زندگی خود منحصر اب علم و دانش پر
کوئی بے علم روٹی سیر ہو کر کھا نہیں سکتا — نہ زرگر اور نہ آہنگر نہ بازی گر نہ سوداگر
مہندس چاہیے مزدور اور اب راج اقلیدس — بس اب دنیا میں بے علموں کا ہے اللہ ہی یاور
نہ پہنیگا کسی جاہل کی شاید سی ہوئی جوتی — بس اب موچی فلاطوں ہے یونہیں کچھ ہوں تو ہوں کمتر
جہانداری میں آج اک اک عامل ہے جم و کسریٰ — جہانگیری میں ہے اک اک سپاہی طغرل و سنجر
گئے وہ دن کہ تھے معدوم کام انسان کے سارے — برابر تھا بئے کا گھونسلا اور آدمی کا گھر
یہ دورہ ہے بنی آدم کی روز افزوں ترقی کا — جو آج اک کام ہے اعلیٰ تو کل ہے اس سے اعلیٰ تر
کوئی دن میں خسارہ سب سے بڑھ کر اسکو سمجھیں گے — کہ دو دن آدمی ٹھہرا رہے یاں ایک حالت پر
نہ تھا غیر از ترقی فرق کچھ انسان و حیواں میں — دیا ہے امتیاز انساں کو یہ تعلیم نے آکر

زمانہ نام ہے میرا تو میں سب کو دکھا دوں گا
کہ جو تعلیم سے بھاگیں گے نام اُن کا مٹا دونگا

مرثیہ غالبِ مرحوم

کیا کہوں حال دردِ پنہانی
وقت کوتاہ قصہ طولانی

عیش دنیا سے ہوگیا دل سرد
دیکھ کر رنگِ عالمِ فانی

کچھ نہیں جز طلسم خواب و خیال
گوشۂ فقر و بزم سلطانی

ہے سراسر فریب وہم و گماں
تاجِ فغفور و تخت خاقانی

بے حقیقت ہے شکل موج سراب
جام جمشید راح ریحانی

لفظ مہمل ہے نطق اعرابی
حرفِ باطل ہے عقل یونانی

ایک دھوکا ہے لحن داؤدی
اِک تماشا ہے حسن کنعانی

نہ کروں تشنگی میں تر لب خشک
چشمۂ خضر کا ہو گر پانی

لوں نہ اک مشت خاک کے بدلے
گر ملے خاتمِ سلیمانی

بحر ہستی بجز سراب نہیں
چشمۂ زندگی میں آب نہیں

جس سے دنیا نے آشنائی کی
اس سے آخر کو کج ادائی کی

تجھ پہ بھولے عبث کوئی اے عمر
تو نے کی جس سے بیوفائی کی

ہے زمانہ وفا سے بیگانہ
ہاں قسم مجھکو آشنائی کی

یہ وہ بے مہر ہے کہ ہے اسکی
صلح میں چاشنی لڑائی کی

ہے یہاں خط وصل سے محروم
جس کو طاقت نہ ہو جدائی کی

ہے یہاں حفظ وضع سے مایوس
جسکو عادت نہ ہو گدائی کی

خندۂ گل سے بے بقا تر ہے
شان ہو جس میں دلربائی کی

جنسِ کاسد سے ناروا تر ہے
خوبیاں جس میں ہوں خدائی کی

بات بگڑی رہی سہی افسوس
آج خاقانی و سنائی کی

رشکِ عرفی و فخرِ طالب مرد
اسد اللہ خان غالب مرد

بلبل ہند مر گیا ہیہات
جس کی تھی بات بات میں اک بات

نکتہ داں نکتہ سنج نکتہ شناس
پاک دِل پاک ذات پاک صفات

شیخ اور بذلہ سنج شوخ مزاج
رند اور مرجع کرام و ثقات

لاکھ مضموں اور اس کا ایک ٹھول
سو تکلف اور اسکی سیدھی بات

ہو گیا نقش دل پہ جو لکھا
قلم اُسکا تھا اور اسکی دوات

تھیں تو دلّی میں اسکی باتیں تھیں
لے چلیں اب وطن کو کیا سوغات

اسکے مرنے سے مر گئی دِلی
خواجہ نوشہ تھا اور شہر برات

یاں اگر بزم تھی تو اسکی بزم
یاں اگر ذات تھی تو اسکی ذات

ایک روشن دماغ تھا نہ رہا
شہر میں اک چراغ تھا نہ رہا

دل کو باتیں جب اسکی یاد آئیں
کسکی باتوں سے دل کو بہلائیں

کسکو جاکر سنائیں شعر و غزل
کس سے دادِ سخنوری پائیں

مرثیہ اسکا لکھتے ہیں احباب
کس سے اصلاح لیں کدھر جائیں

پست مضمون ہے نوحہ استاد
کس طرح آسماں پہ پہنچائیں

لوگ کچھ پوچھنے کو آئے ہیں — اہلِ میت جنازہ ٹھہرائیں
لائیں گے پھر کہاں سے غالب کو — سوئے مدفن ابھی نہ لے جائیں
اس کو اگلوں پہ کیوں نہ دیں ترجیح — اہلِ انصاف غور فرمائیں
قدسی و صائب و اسیر و کلیم — لوگ جو چاہیں ان کو ٹھہرائیں
ہم نے سب کا کلام دیکھا ہے — ہے ادب شرط منہ نہ کھلوائیں

غالبِ نکتہ داں سے کیا نسبت
خاک کو آسماں سے کیا نسبت

شہر میں جو ہے سوگوار ہے آج — اپنا بیگانہ اشکبار ہے آج
نازشِ خلق کا محل نہ رہا — رحلتِ فخرِ روزگار ہے آج
بارِ احباب جو اٹھاتا تھا — دوشِ احباب پر سوار ہے آج
دل میں مدت سے تھی خلش جس کی — وہی برچھی جگر کے پار ہے آج
دلِ مضطر کو کون دے تسکیں — ماتمِ یارِ غمگسار ہے آج
تلخیِ غم کہی نہیں جاتی — جانِ شیریں بھی ناگوار ہے آج
کس کو لاتے ہیں بہرِ دفن کہ قبر — ہمہ تن چشمِ انتظار ہے آج

غم سے پھرتا نہیں دلِ ناشاد
کس سے خالی ہوا جہاں آباد

نقدِ معنی کا گنجداں نہ رہا — خوانِ مضموں کا میزباں نہ رہا
ساتھ اس کے گئی بہارِ سخن — اب کچھ اندیشۂ خزاں نہ رہا
ہوا اک ایک کارواں سالار — کوئی سالارِ کارواں نہ رہا

رونق حسن تھا بیاں اس کا
گرم بازار گل رخساں نہ رہا

عشق کا نام اس سے روشن تھا
قیس و فرہاد کا نشاں نہ رہا

ہو چکیں حسن و عشق کی باتیں
گل و بلبل کا ترجماں نہ رہا

اہل ہند اب کرینگے کس پر ناز
رشک شیراز و صفہاں نہ رہا

زندہ کیونکر رہیگا نام ملوک
بادشاہوں کا مدح خواں نہ رہا

کوئی ویسا نظر نہیں آتا
وہ زمیں اور وہ آسماں نہ رہا

اٹھ گیا تھا جو مایہ دار سخن
کسکو ٹھہرائیں اب مدار سخن

ڈاکٹر سر محمد اقبال

چاند

اے چاند حسن تیرا فطرت کی آبرو ہے
طوف حریم خاکی تیری قدیم خو ہے

یہ داغ سا جو تیرے سینہ میں ہے نمایاں
عاشق ہے تو کسیکا یہ داغ آرزو ہے

میں مضطرب زمیں پر بیتاب تو فلک پہ
تجھکو بھی جستجو ہے مجھکو بھی جستجو ہے

انساں ہے شمع جس کی محفل وہی ہے تیری
میں جسطرف رواں ہوں منزل وہی ہے تیری

تو ڈھونڈتا ہے جسکو تاروں کی خامشی میں
پوشیدہ ہے وہ شاید غوغائے خامشی میں

استادہ سرو میں ہے سبزہ میں سو رہا ہے
بلبل میں نغمہ زن ہے خاموش ہے کلی میں

آ میں تجھے دکھادوں رخسار روشن اُسکا
نہروں کے آئینہ میں شبنم کی آرسی میں

صحرا و دشت و در میں کہسار میں وہی ہے
انساں کے دل میں تیرے رخسار میں وہی ہے

نیا شوالہ

سچ کہدوں اے برہمن گر تو برا نہ مانے
تیرے صنم کدوں کے بت ہو گئے پرانے
اپنوں سے بیر رکھنا تو نے بتوں سے سیکھا
جنگ و جدل سکھایا واعظ کو بھی خدا نے
تنگ آکے میں نے آخر دیر و حرم کو چھوڑا
واعظ کا وعظ چھوڑا چھوڑے ترے فسانے

پتھر کی مورتوں میں سمجھا ہے تو خدا ہے
خاک وطن کا مجھکو ہر ذرہ دیوتا ہے

آ غیریت کے پردے اک بار پھر اُٹھادیں
بچھڑوں کو پھر ملادیں نقش دوئی مٹادیں
سونی پڑی ہوئی ہے مدت سے دل کی بستی
آ اِک نیا شوالہ اس دیس میں بنادیں
دنیا کے تیرتھوں سے اونچا ہو اپنا مندر
دامانِ آسماں سے اُسکا کلس ملادیں
ہر صبح اُٹھ کے گائیں منتر وہ میٹھے میٹھے
سارے پجاریوں کو مے پیت کی پلادیں

شکتی بھی شانتی[۱] بھی بھگتوں کے گیت میں ہے
دھرتی[۲] کے باسیوں[۳] کی مکتی[۴] پریت[۵] میں ہے

---

۱ طاقت ۲ سکون ۳ زمین ۴ باشندے ۵ نجات ۶ محبت۔

تصویر درد

عطا مجکو بیاں ایسا ہو ازبسکہ بیانوں میں
کہ باہم عرش کی طائر ہیں میری ہمزبانوں میں

رلاتا ہے ترا نظارہ اے ہندوستاں مجھکو
کہ عبرت خیز ہی تیرا فسانہ سب فسانوں میں

دیا رونا مجھے ایسا کہ سب کچھ دیدیا گویا
لکھا کلک ازل نے مجھکو تیرے نوحہ خوانوں میں

سن اے غافل صدا میری یہ ایسی چیز ہی جسکو
وظیفہ جان کر پڑھتے ہیں طائر بوستانوں میں

وطن کی فکر کر ناداں مصیبت آنیوالی ہے
تری بربادیوں کے مشورے ہیں آسمانوں میں

ذرا دیکھ اسکو جو کچھ ہو رہا ہے ہونیوالا ہے
دھرا کیا ہی بھلا عہد کہن کی داستانوں میں

نہ سمجھو گے تو مٹ جاؤ گے اے ہندوستاں والو
تمہاری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں

یہی آئین قدرت ہے یہی اسلوب فطرت ہے
جو ہے راہ عمل میں گامزن محبوب فطرت ہے

ہویدا آج اپنے زخم پنہاں کرکے چھوڑونگا
لہو رو رو کے محفل کو گلستاں کرکے چھوڑونگا

جلانا ہی مجھے ہر شمع دل کو سوز پنہاں سے
تری ظلمت میں میں روشن چراغاں کرکے چھوڑونگا

پرونا ایک ہی تسبیح میں ان بکھرے دانوں کو
جو مشکل ہی تو اس مشکل کو آساں کرکے چھوڑونگا

مجھے اے ہمنشیں رہنے دے شغل سینہ کاوی میں
کہ میں داغ محبت کو نمایاں کرکے چھوڑونگا

دکھا دونگا جہاں کو جو مری آنکھوں نے دیکھا ہی
تجھے بھی صورت آئینہ حیراں کرکے چھوڑونگا

جو ہے پردوں میں پنہاں چشم بینا دیکھ لیتی ہے
زمانہ کی طبیعت کا تقاضا دیکھ لیتی ہے

نجم الدوله دبیر الملک مرزا اسد الله خاں غالب

خان بہادر سید اکبر حسین اکبر

ڈاکٹر سر محمد اقبال

دوا ہر دکھ کی ہے مجروح تیغ آرزو رہنا
علاج زخم ہے آزاد احسان رفو رہنا

تھمے کیا دیدۂ گریان وطن کی نوحہ خوانی میں
عبادت چشم شاعر کی ہے ہر دم باوضو رہنا

بنائیں کیا سمجھ کر شاخ گل پر آشیاں اپنا
چمن میں آہ کیا رہنا جو ہو بے آبرو رہنا

نہ رہ اپنوں سے بے پروا اسی میں خیر ہے تیری
اگر منظور ہے دنیا میں او بیگانہ خو رہنا

محبت ہی سے پائی ہے شفا بیمار قوموں نے
کیا ہے اپنے بخت خفتہ کو بیدار قوموں نے

ستارہ

قمر کا خوف کہ ہے خطرۂ سحر تجھکو
مآل حسن کی کیا مل گئی خبر تجھکو؟

متاع نور کے لٹ جانیکا ہے ڈر تجھکو؟
ہے کیا ہراس فنا صورت شرر تجھکو؟

زمیں سے دور دیا آسماں نے گھر تجھکو
مثال ماہ اڑھائی قبائے زر تجھکو

غضب ہے پھر تری ننھی سی جان ڈرتی ہے
تمام رات تری کانپتے گذرتی ہے

چمکنے والے مسافر عجب یہ بستی ہے
جو اوج ایک کا ہے دوسرے کی پستی ہے

اجل ہے لاکھوں ستاروں کی اک ولادت مہر
فنا کی نیند مئے زندگی کی مستی ہے

وداع غنچہ میں ہے راز آفرینش گل
عدم عدم ہے کہ آئینہ دار ہستی ہے

سکوں محال ہے قدرت کے کارخانے میں
ثبات ایک تغیر کو ہے زمانے میں

جگنو

جگنو کی روشنی ہے کاشانۂ چمن میں
یا شمع جل رہی ہے پھولوں کی انجمن میں؟

آیا ہے آسماں سے اڑ کر کوئی ستارہ
یا جان پڑ گئی ہے مہتاب کی کرن میں؟

یا شب کی سلطنت میں دن کا سفیر آیا؟
غربت میں آ کے چمکا گمنام تھا وطن میں

تکمہ کوئی گرا ہے مہتاب کی قبا کا
ذرہ ہے یا نمایاں سورج کے پیرہن میں

حسن قدیم کی یہ پوشیدہ اک جھلک تھی؟
لے آئی جسکو قدرت خلوت سے انجمن میں

چھوٹے سے چاند میں ہے ظلمت بھی روشنی بھی
نکلا کبھی گہن سے آیا کبھی گہن میں

پروانہ اک پتنگا جگنو بھی اک پتنگا
وہ روشنی کا طالب یہ روشنی سراپا

ہر چیز کو جہاں میں قدرت نے دلبری دی
پروانہ کو تپش دی جگنو کو روشنی دی

رنگین نوا بنایا مرغان بے زباں کو
گل کو زبان دیکر تعلیم خامشی دی

نظارۂ شفق کی خوبی زوال میں تھی
چمکا کے اس پری کو تھوڑی سی زندگی دی

رنگین کیا سحر کو بانکی دلہن کی صورت
پہنا کے لال جوڑا شبنم کی آرسی دی

سایہ دیا شجر کو پرواز دی ہوا کو
پانی کو دی روانی موجوں کو بے کلی دی

یہ امتیاز لیکن اک بات ہے ہماری
جگنو کا دن وہی ہے جو رات ہے ہماری

قصائد

قصیدہ وہ نظم ہے جو کسی کی مدح یا ہجو میں کہی جائے شعرا نے مناظرِ قدرت کی تعریف میں بھی قصائد کہے ہیں قصیدہ میں مطلع اور ردیف و قافیہ کی پابندی مثل غزل کی جاتی ہے۔

مرزا محمد رفیع سودا

قصیدہ بہاریہ

اُٹھ گیا بہمن و دے کا چمنستاں سے عمل
تیغِ اُردی نے کیا ملکِ خزاں مستاصل

سجدۂ شکر میں ہے شاخ ثمردار ہر ایک
دیکھکر باغ جہاں میں کرمِ عزّ و جل

قوت نامیہ لیتی ہے نباتات کا عرض
ڈال سے پات تلک پھول سے لیکر تا پھل

واسطے خلعتِ نوروز کے اس باغ کی بیچ
آب جو قطع لگی کرنے روش پر مخمل

بخشتی ہے گلِ نورستہ کی رنگ آمیزی
پوشش چھینٹ قلم کار بہر دشت و جبل

عکس گلشن نہر میں پڑے ہے کہ جس کے آگے
کار نقاشی مانی ہے ددم ۂ اول

تار بارش میں پروتے ہیں میں گہر ہائے تگرگ
ہار پہنانے کو اشجار کے ہر سو بادل

بارسے آب رواں عکس ہجوم گل کے
لوٹے ہے سبزے پہ از بسکہ ہوا بیکل

جوش روئیدگی خاک سے اب دور نہیں
شاخ میں گاؤ زمیں کے بھی جو پھوٹے کوپل

شاخ میں گل کی نزاکت یہ بہم پہنچی ہے
شمع ساں گرمی نظارہ سے جاتی ہے پگھل

فکر رہتی ہے مجھے یہ کہ زباں سے اپنی
کہیں دعوای خدائی نہ کریں لات و ہبل

یاسمن رنگ جو رہتی ہے خزاں سے مانا
چاہتی ہے یہ سماجت کرے سبزے سے بدل

چشم نرگس کی بصارت کے زبس ہے درپے
غنچۂ لالہ نے سرمہ سے بھری ہے مکحل

اسقدر محو تماشا ہے کہ نرگس کی طرح
چشم سیارہ گلستاں سے جھپکتی نہیں پل

آب جو گرد چمن لمعہ خورشید سے ہے
خط گلزار کے صفحہ پہ طلائی جدول

سایۂ برگ ہے اس لطف سے ہر اک گل پر
ساغر لعل میں جوں کیجئے زمرد کو حل

سنگ نے رتبہ آئینہ کیا ہے پیدا
تیغ کہسار ہوئی بسکہ ہوا سے صیقل

برگ برگ چمن ایسی ہی صفا رکھتا ہے
گل کو دیکھو تو نگہ جا رہے سنبل پہ پھسل

لڑکھڑاتی ہوئی پھرتی ہے خیاباں میں نسیم
پاؤں رکھتی ہے صبا صحن میں گلشن کے سنبھل

دانہ جس شور زمیں میں کہ پھیلا دہقاں سے
سبز واں دانہ شبنم سے ہوا ہے جنگل

کشت کر نہیں ہر اک تخم سے از فیض ہوا
گرتے گرتے بزمیں برگ برآتا ہے نکل

جوہری کو چمنستان جہاں میں اس فصل
آگیا لعل و زمرد کے پرکھنے میں خلل

تاکجا شرح کروں میں کہ بقول عرفی
اخگر از فیض ہوا سبز شود در منقل[1]

[1] ہوا کے فیض سے چنگاری انگیٹھی میں سبز ہو جائے (یعنی پتی ہو جائے)۔

حکیم مومن خان مومن

یادِ ایامِ عشرتِ فانی — نہ وہ ہم ہیں نہ وہ تن آسانی

جائیں وحشت میں سوئے صحرا کیوں — کم نہیں اپنے گھر کی ویرانی

ایسی وحشت سرا میں آئے کون — بے دری کر رہی ہے دربانی

نکتہ سنجوں سے جی میں ہے پوچھوں — کہ میں شہری ہوں یا بیابانی

کیا ہوئی وہ بلندیٔ دیوار — کیا ہوئے وہ عماد طولانی

شورِ زاغ و زغن ہے سمع خراش — اب کہاں بلبلِ غزل خوانی

صرف دلقِ گدا ہوئے پردے — زینت افزائے کاخِ سلطانی

یا ظروفِ سماط سے مجھے تھا — دعویٔ قیصری و خاقانی

یا نہیں ہے مرقع و کشکول — تا کروں تازہ رسمِ ساسانی

مسندِ گوہریں کا دھیان آیا — پوچھتے کیا ہو وجہ گریانی

یا یہاں پرنیان و اطلس سے — جلوہ گر تھی سپہر سامانی

یا یہ احوال ہے کہ چاک ہوا — تنگیوں سے لباسِ عریانی

ایک دن یوں ہجومِ یاراں تھا — جیسے اب مجمعِ پریشانی

اے فلک دل کو داغ کرتی ہے — زرِ خورشید کی درخشانی

بے زری سے مری تجھے حاصل — کچھ نہ ہوگا بجز پشیمانی

تجھے معلوم ہے کہ ہوں میں کون — کھول دوں میں یہ رازِ پنہانی

مدح خوان شہ وزیر لقب
ختم جس پر ہوئی سخندانی

کیا کہوں اسکے دستِ ہمت کی
ہیں گہرباری وزر افشانی

اس کے عہد کرم کی نسبت سے
بڑھ گئی عمر عالم فانی

دوری اپنی نہیں ہو مانع فیض
مہر کو کیا حجابِ ظلمانی

گرگ نے دور عدل میں اسکے
سیکھ لی راہ ورسم چوپانی

خنجرِ جاں شکاف میں اسکے
ابروے یار کی سی برّانی

زیرِ راں اُسکے توسن چالاک
رشک اسپ سپہر گردانی

شوخئ یار کی سی چالاکی
نگہِ شوق کی سی جولانی

روزِ جنگ اسکے نیم جولاں میں
صرصرِ عاد کی سی طغیانی

اے سخن سنج نکتہ داں تیری
کس زباں سے کروں ثنا خوانی

مرزا اسد اللہ خاں غالب

صبحدم دروازۂ خاور کھلا
مہر عالمتاب کا منظر کھلا

خسرو انجم کے آیا صرف میں
شب کو تھا گنجینۂ گوہر کھلا

وہ بھی تھی اک سیمیا کی سی نمود
صبح کو رازِ مہ و اختر کھلا

ہیں کواکب کچھ نظر آتے ہیں کچھ
دیتے ہیں دھوکا یہ بازیگر کھلا

سطح گردوں پر پڑا تھا رات کو
موتیوں کا ہر طرف زیور کھلا

صبح آیا جانبِ مشرق نظر
اک نگارِ آتشیں رخ سر کھلا

تھی نظر بندی کیا جب ردِ سحر
بادۂ گلرنگ کا ساغر کھلا

لا کے ساقی نے صبوحی کیلئے
رکھ دیا ہے ایک جامِ زر کھلا

بزمِ سلطانی ہوئی آراستہ
کعبۂ امن و اماں کا در کھلا

تاجِ زریں مہرِ تاباں سے سوا
خسروِ آفاق کے منہ پر کھلا

شاہِ روشن دل بہادر شہ کہ ہے
رازِ ہستی اس پہ سر تا سر کھلا

وہ کہ جسکی صورتِ تکوین میں
مقصدِ نہ چرخ و ہفت اختر کھلا

وہ کہ جسکے ناخنِ تاویل سے
عقدۂ احکامِ پیغمبر کھلا

پہلے دارا کا نکل آیا ہے نام
اُسکے سرہنگوں کا جب دفتر کھلا

روشناسوں کی جہاں فہرست ہے
واں لکھا ہے چہرۂ قیصر کھلا

توسنِ شہ میں وہ خوبی ہے کہ جب
تھان سے وہ غیرتِ صرصر کھلا

نقشِ پا کی صورتیں وہ دلفریب
تو کہے بت خانۂ آذر کھلا

مجھ پہ فیضِ تربیت سے شاہ کے
منصبِ مہر و مہ و اختر کھلا

لاکھ عقدے دل میں تھے لیکن ہر ایک
میری حدِ وسع سے باہر کھلا

تھا دلِ وابستہ قفلِ بے کلید
کس نے کھولا کب کھلا کیونکر کھلا

باغِ معنی کی دکھاؤں گا بہار
مجھ سے گر شاہِ سخن گستر کھلا

ہو جہاں گرمِ غزل خوانی نفس
لوگ جانیں طبلۂ[۱] عنبر کھلا

[۱] ڈبہ۔

شیخ محمد ابراہیم ذوق

تہنیت غسل صحت مرزا ابوظفر بہادر شاہ

واہ وا کیا معتدل ہے باغ عالم کی ہوا
مثل نبض صاحب صحت ہے ہر موج صبا
بھرتی ہے کیا کیا مسیحائی کا دم باد بہار
بن گیا گلزار عالم رشک صدر دارالشفا
ہے گلوں کے حق میں شبنم مرہم زخم جگر
شاخ بشکستہ کو ہے باراں کا قطرہ مومیا
ہوگیا زائل مزاج دہر سے یاں تک جنوں
بید مجنوں کا بھی صحرا میں نہیں باقی پتا
ہوتا ہے لطف ہوا سے اسقدر پیدا لہو
برگ میں ہر نخل کے سرخی ہے جوں برگ حنا
پائی یہ اصلاح صفرا نے کہ دنیا میں کہیں
زرد چشم اب دیکھنے کو بھی نہیں ہے کہربا
ہر مزاج بلغمی میں ہوتی ہے تولید خوں
چاندنی کا پھول ہو گر ارغوانی ہے بجا
نام کو اشیاء میں نے تلخی رہی نے سمیت

بنگئی تریاق افیون زھر میٹھا ہو گیا
کیا عجب جدوار کی تاثیر گر رکھے زقوم
کیا عجب گر آبِ حنظل دیوے شربت کا مزا
نیش کی جا نوشش ہو دنبالۂ زنبور میں
کام میں افعی کے ہو مہرہ بجائے آبلا
راحت و آرام کا اس دور میں ہے دور دور
چاہیے واقف نہ ہو دوران سر سے آسیا
موتیا بند آنکھ میں اپنی جو رکھتی ہے صدف
اب رکھے ہے روشنی مثلِ دل اہلِ صفا
آگیا اصلاح پر ایسا زمانے کا مزاج
تا زبانِ خامہ بھی آتا نہیں حرفِ دوا
نسخہ پر لکھنے نہیں پاتا ہو الشافی طبیب
کہتا ہے بیمار بس کر مجھکو بالکل ہے شفا
فرق چاہا یاں تک اعضائے بدن سے درد نے
درد کے جو حرف ہیں وہ آپ ہی ہیں سب جدا
لاغروں کو ہو کمالِ تاب و طاقت یہ شتاب
کیسے دو ہفتے ہلال اک شب میں ہو بدرالدجے
صبح صادق کے ہے کو سر میں سپیدی آگئی
لیکن اس پیری میں بھی صادق ہے ایسی اشتہا

بھوک کی شدت سے اسکو ایک نفس فرصت نہو
قرص سے خورشید کے جبتک نہ کرلے ناشتا

رات بھر ڈھونڈھا کیا انجم کے دانے چرخ پیر
پھر جو دیکھا صبح کو اصلا شکم میں کچھ نہ تھا

پہنچی یہ تنقیح کی نوبت کہ نوبت خانہ میں
لیتی ہے جی کھول کر کیا کیا ڈکاریں کرنا

کوس پھولا ہے خوشی سے نفخ کا کیا دخل ہے
جوں حباب اسکے نہیں مطلق شکم میں امتلا

ہضم کا بل اسقدر معدے نے پہنچایا بہم
جید الکیموس ہے جو حلق سے اتری غذا

ہے مزاج اہل عالم یہ قریب اعتدال
ساتوں اقلیمیں ہیں گویا اب بحظ استوا

رکھے گا تعویذ اور گنڈا کوئی کیوں اپنے پاس
باغ عالم میں یہی عالم جو صحت کا رہا

دیگا طاؤس اپنے بال و پر سے سارے نقش دہو
پھینک دیگی توڑ کر گنڈا گلے سے فاختا

اس قدر جاتی رہی عالم سے بیماری کہ آج
نام گلشن میں نہیں ہے نرگس بیمار کا

واقعی کس طرح سے صحت نہ اک عالم کو ہو

جب کہ ہو اسکی نوید غسلِ صحت جاں فزا
وہ ولی عہد جہاں مرزا محمد بو ظفر
اسکی قوت گر ضعیفوں کو بنا دے اقویا
تقویت کا یہ اثر ہو عام جو ہیں برگ زرد
ہوں مقوی دِل وجان مثلِ اوراقِ طلا
شادیٔ صحت سے اُس کی آج ہو کر شاد شاد
تہنیت خوانی میں ہیں سرگرم سب مدحت سرا
میں بھی اس رشکِ چمن محفل میں وہ مطلع پڑھوں
بلبلِ تصویر سُنکر بول اُٹھے صد مرحبا

آج ہے عالم میں وہ روزِ سعادت انتما
دے اگر زاغ و زغن بیضہ تو پیدا ہو ہُما

ایضاً

کنجِ حیرت میں کروں علم خموشی تحصیل
پیشِ دشمن غم گذر حق سی نہیں سانچ کو آنچ
ہوتے سیر ستے ہیں مردانِ ولاور ممتاز
فکر بیہودہ میں کس واسطے ہے تو پابند
خواب غفلت سے ہو بیدار کہ آئی پیری
رشتہ عمر ہے وہ تار کھینچا اور ٹوٹا

یہ عجب مدرسہ ہی جسمیں نہ ہے قال نہ قیل
دیکھ ہے آتشِ نمرود گلستانِ خلیل
ورنہ صورت میں تو کچھ کم نہیں شہباز سے چیل
کچھ نکال اپنے لئے ذوق نکلنے کی سبیل
نہیں مہتاب یہ ہی روشنی صبح رحیل
کچھ اگر وقت معلق کی طرف سے نہ ہو ڈھیل

وہیں منزل ہی جہاں ٹھہری حیاتِ گذراں
کہ بے راہ فنا کوئی نہ فرسخ ہے نہ میل
مشق اندوہ سے اک روز نہیں تو بیکار
تیرے مکتب میں نہیں کوئی بھی روزِ تعطیل
ہے تمنای زر و مال تو سب جائیگا چھوڑ
چھوڑ جانیکو تو کافی ہے فقط ذکرِ جمیل
مژدہ عید سے ہی دیکھ تو کیا رنگ چمن
دشت سے باغ تلک باغ سے لی تا بہ نخیل

پھر بہارِ چمنِ عمر میں دلگیر ہے کیوں
سیر کر سیر کہ ہی فرصتِ گلگشت خلیل

خواجہ الطاف حسین حاؔلی

میں بھی ہوں حسن طبع پر مغرور
مجھ سے اٹھیں کے انکے ناز ضرور
خاک ہوں اور عرش پر ہے دماغ
مجھ سے برتر ہے میری طبع غیور
خاکساری پہ مری کوئی نہ جائے
میرے دلمیں بھرا ہوا ہے غرور
نہ گنو اہل عصر میں مجھکو
میں بہت کھینچتا ہوں آپ کو دور
چشمہ آب خضر کے مانند
چشم اہل جہاں سے ہوں مستور
دل سے داد اپنی لے چکا ہوں بہت
مجھکو پروا نہیں کہ ہوں مشہور
مثل یوسف دکھائے جوہر ذات
جسکو بکنا ہو مفت یاں منظور
جو نہ سمجھے مجھے کہ کیا ہوں میں
اس سے شکوہ نہیں کہ ہی معذور
لذتِ مے سے جو نہ ہو آگاہ
اسکو کیا قدر خوشۂ انگور
جسکے آنکھیں نہ ہوں وہ کیا جانے
روز روشن ہے یا شب دیجور

پہلے ہوگی کسیکو قدر ہنر — اٹھ گیا اب جہاں سے دستور
سخن حق کی داد لوں کس سے — سن چکا ہوں فسانہ منصور
مژدہ خسرو کو وصل شیریں کا — ہو چکی سعی کوہکن مشکور
ہوں تماشائے شہر نابینا — ہے برابر مرا خفا و ظہور
در یکتا ہوں اور رہوں بے آب — ماہ کامل ہوں اور رہوں بے نور
چشمہ پیدا و کارواں تشنہ — بادہ پر زور و انجمن مخمور
کاش اس عہد میں مجھے پاتے — تھا سخن جب کہ قبلۂ جمہور
جس سے ہوتا ہے خستہ سینۂ ہوش — ہے زباں میری وہ دم ساطور
جس سے ہوتا ہے کور پروانہ — ہے مری شمع میں وہ لمعہ نور
شرح نقطے کی گر کروں تحریر — تنگ ہو عرصۂ نقوش و سطور
ترک عشق بتاں کریں عشاق — مجھ سے سن پائیں گر ستائش حور
گر کروں ذکر لذت طاعات — تلخ کر دوں مذاق فسق و فجور
چھیڑ دوں گر فسانۂ فرہاد — دل خسرو میں ڈال دوں ناسور
کرنے جاؤں جو حق سے عذر گناہ — لیکے آؤں نوید عفو قصور
لوں ملائک سے داد حسن کلام — گر لکھوں نعت سرور جمہور
وہ شہنشاہ اُمتی جس کا — یاں گنہگار اور واں مغفور
وہ خداوند خدمتی جس کا — یاں سبک سار اور واں ماجور
لب شیریں کلام سے اُس کے — دوست بھی شاد غیر بھی مسرور
ہو سکے اسکی خوبیوں کا شمار — نعمتیں حق کی ہوں اگر محصور

میں ترے در پہ سن کے آیا ہوں / نام تیرا شفیع روز نشور

کچھ نہیں زادِ راہ پاس اپنے / مگر امید عفوِ ربِّ غفور

طبع غالب ہے اور میں مغلوب / نفس قاہر ہے اور میں مقہور

بحرِ غفلت میں ہوں سراسر غرق / نشۂ کبر میں ہوں بالکل چور

نفس امّارہ اور دیو مرید[1] / یہ ہے افعی تو وہ ہے کلب عفور[2]

مجھ سے جو کام چاہئے لیجئے / جھوٹ ہو یا فریب ہو یا زور[3]

حسد و بغض و غیبت و بہتان / بخل و حرص و ہوا و فسق و فجور

ایک جو مجھ سے بن نہیں آتی / ہے وہ خدمت کہ جس پہ ہوں مامور

دل لگے بندگی میں کیا امکان / لب ہلے ذکرِ حق میں کیسا مذکور

فی المثل ہے مری مسلمانی / جیسے زنگی کا نام ہو کافور

ہاں مگر کچھ امید بندھتی ہے / تیرے زمرے میں گر ہوا محشور

جب ترے کارواں میں جا پہنچا / پھر رہا بابِ خلد کتنی دور

دور ہی آستان والا سے / ہے بہت تنگ حالیؔ مہجور

اب دعا یہ ہے اے شفیع امم / بسکہ بیتاب ہے دل رنجور

جا لگے تیرے در پہ کشتی عمر / جب کروں بحرِ زندگی سے عبور

جیتے جی دل میں یاد ہو تیری
مرتے دم لب پہ ہو ترا مذکور

۱ سرکش شیطان ۲ دیوانہ کتا۔ ۳ جھوٹ۔

نظمِ جدید

۱۸۷۴ء تھا کہ نظم اردو میں انقلاب عظیم برپا ہوا۔ اِس انقلاب کا سہرا مولانا آزاد مرحوم اور مولانا حالی مرحوم کے سر ہے۔ جنہوں نے پرانی روش کو ترک کر کے نظمِ جدید کی داغ بیل ڈالی۔ ذیل میں جدید شاعری کے نمونے درج کیے جاتے ہیں۔

بڑھے چلو

شمس العلماء مولوی محمد حسین صاحب آزاد دہلوی

اقبال اک برس جو مرا تاج سر ہوا
شملہ پہ مجھ کو موسم سرما بسر ہوا

جاڑے کے مارے چلتے ہوئے پانی تھم گئے
اور جو تھمے ہوئے تھے وہ یخ ہو کے جم گئے

دامانِ کوہسار میں سورج بھی لیٹ کر
دبکا لحاف برف میں منہ کو لپیٹ کر

دیکھو جدھر کو سب در و دیوار تھے سفید
باہر چلو تو دامن کہسار تھے سفید

پتے تھے آکے جاڑے نے سب دور کر دیئے
اور تھے درخت برف نے بلور کر دیئے

اک رات بیٹھے بیٹھے جو میں تنگ آ گیا
گھر سے نکل کے سوئے بیاباں چلا گیا

دیکھا کہ دوڑا جاتا ہے اک تازہ نوجوان
ہمت کے ہاتھ میں ہے اٹھائے سیہ نشاں

ہے اُس پہ روشنی سے لکھے۔ ہاں بڑھے چلو

ہمت کا اسکی حال میں لکھکر بتاؤں کیا
کاغذ کے کوزے میں کہو دریا کو لاؤں کیا
جاتا تھا نوجوان عجب آن بان سے
پیدا شکوہ و شان تھی اسکے نشان سے
چلتا قدم اٹھائے ہوا اور سر جھکائے تھا
گویا خروش و جوش کو اپنے دبائے تھا
کیا جانے فکر مند تھا یا کیا ملال تھا
تیور بگڑ گئے تھے کچھ ایسا خیال تھا
سینے میں نعرہ بند تھا منہ میں تھی صدا
لیکن خموشی اس کی باآواز کرنا

دیتی تھی ہر طرف یہ صدا۔ ہاں بڑھے چلو

وہ آگے آگے جاتا تھا میں ساتھ ساتھ تھا
دامن تھا اسکے شوق کا اور میرا ہاتھ تھا
جو آگے کچھ سیاہئے شب راہ پر پڑی
آبادی ایک شہر کی ہم کو نظر پڑی
خوشحال گھر اور اُن میں خوشی بولتی ہوئی
باتیں کہ دِل سے غم کی گرہ کھولتی ہوئی
گھر گھر اُجالے تھے سرِ دیوار سامنے
دروازوں سے چراغ نمودار سامنے
تھے ہر طرف سے جاڑے کا سامان پکارتے
تارے بھی اِک کنارے سے تھے آنکھ مارتے
آرام کہہ رہا تھا کہ آگے نہ جانہ جا
اور میں بھی کہہ رہا تھا کہ بچ بچ بچا بچا
سمجھانیوالے سب یونہی سمجھاکے رہ گئے
اتنا بھی وہ نہ سمجھا کہ ہیں کیا یہ کہہ رہے

چپکے سے گر کہا تو کہا۔ ہاں بڑھے چلو

پھیرا تھا منہ ابھی نہ شب تیرہ فام نے
اِک پیر مرد تجربہ کار آیا سامنے
پیری کی برف نے تھا اسے تن بدن لیا
موئے سفید نے نمدی پیرہن دیا
بولا کہ اے جوان عجب کالی رات ہے
اور وقت وہ کہ رات ہی یا حق کی ذات ہے
سنسان جنگل اور درختوں کی سائیں سائیں
چاروں طرف پہاڑوں میں تھیں دوڑتی بلائیں
طوفانِ برف سر پہ کھڑا ہے تلا ہوا
ہے یہ درہ کہ موت کا منہ ہے کھلا ہوا

مانا کہ لطف و عیش و طرب پر نظر نہیں — جاتا کہاں ہے جان کا بھی تجھکو ڈر نہیں
یہ سُن کے نکلا شعلہ دلِ نوجوان سے — گویا ستارہ ٹوٹ پڑا آسمان سے

اور اُس نے دی کڑک کے صدا ہاں بڑھے چلو

تھی رات رنگ ابھی رخ عالم پہ پھیرتی — گہ مشک اڑاتی تھی گہے عنبر بکھیرتی
کیا جانیے ہم نکل کے کدھر کے کدھر گئے — دیکھا کہ جاڑے زور سے اپنے اتر گئے
موسم بھی معتدل ہے ہوا بھی لہک گئی — خوشبو کا ہے یہ حال کہ دنیا مہک گئی
اور جانور ہیں رات کے آواز دے رہے — بل جل کے ساتھ جیسے ہوں دم ساز دے رہے
پانی کی ہیں پہاڑوں سے آوازیں آرہیں — جو زیر و بم کے دور سے ہیں سر ملا رہیں
ناگاہ آئی ایک پری زاد سامنے — کی رمز گل سے بلبلِ رنگیں کلام نے
جاتے ہو ایسے وقت میں کس کام کے لئے — آرام کیجیے رات ہے آرام کے لئے
دیکھا پری کو اُس نے مگر چشم ناز سے — اور پاس ہو کے نکلا عجب سوز و ساز سے

پر اتنا مسکرا کے کہا۔ ہاں بڑھے چلو

ناگہ فلک پہ دامن شب چاک ہو گیا — لبریز نور سے طبقِ خاک ہو گیا
منہ رات کا جو صبح کے آنے سے فق ہوا — گلگونہ لے کے سامنے رنگِ شفق ہوا
روئے سحر پہ شان تھی نور ظہور کی — چاروں طرف وہ زمزمہ خوانی طیور کی
وہ گہری سبزیوں میں گل تر کی لالیاں — اور اوس سے بھری ہوئی پھولوں کی تھالیاں
وہ صبح کی ہوا سے درختوں کا جھومنا — اور جھوم جھوم کر وہ رخ گل کو چومنا
سبزی جو روئے خاک پہ مخمل بچھا گئی — شبنم بھی آ کے رات کو موتی لٹا گئی
پانی وہ صاف صاف جو بل کھاتے جاتے تھے — پارے کے سانپ گھاس پہ لہراتے جاتے تھے

سورج نے سر نکالا یکایک پہاڑ پر
بولا جوان شیر کی صورت دہاڑ کر
آرام کی نہیں ہے یہ جا ہاں بڑھے چلو

تبدیل جبکہ دھوپ سے رنگِ سحر ہوا
اِک مدرسے کے آگے سے اُسکا گذر ہوا
تھا پاس اِک خرابہ مسجد پڑا ہوا
مُلّا تھا اُس میں بر سرِ ممبر چڑھا ہوا
تھا ہر طرف کو دامنِ تقریر کھینچتا
اور دوزخ و بہشت کی تصویر کھینچتا
حور و قصور پر تھا دلوں کو لبھا رہا
دوزخ دکھا کے خلقِ خدا کو ڈرا رہا
تھے لوگ اسکی باتوں میں مدہوش ہو رہے
اور معتقد تھے سب ہمہ تن گوش ہو رہے
دیکھا جو نوجوان کو اس مردِ پیر نے
اپنی لکیر پیٹی پرانے فقیر نے
یعنی کہ آؤ خلد کا نقشہ دکھائیں ہم
بیٹھو کہ تم کو عرش کے اوپر اڑائیں ہم
بولا جواں کہ اب وہ زمانے گذر گئے
وہ رات ہو چکی وہ فسانے گذر گئے
اور سب سے پھر اشارہ کیا ہاں بڑھے چلو

ملکِ فنا اگرچہ بہت بے ثبات ہے
بے یاد بے مدار ہر اک اسکی بات ہے
لیکن بجا کہا جو کسی نے کہا ہے یہ
ہمت کے معرکوں کیلئے خوب جا ہے یہ
پر دیکھتا جو ہوں تو یہاں طرفہ حال ہے
مطلق اِدھر نہیں کوئی کرتا خیال ہے
دن رات ہے امیروں کو آرام سے غرض
ساقی سے مدعا ہے ویا جام سے غرض
باقی فلک زدوں کا تو پھر کیا ٹھکانا ہے
افلاس انکے واسطے پہلا بہانہ ہے
اور جو کہ رکھتے ہمت و غیرت سے کام ہیں
محنت سے پیٹ پال رہے صبح و شام ہیں
لڑکے وظیفوں پر ہیں سبق یاد کر رہے
تنخواہوں پر ہیں مُنتیں استاد کر رہے
پھرتے فقیر مانگتے در در ہیں صبح و شام
کہتے ہیں بار بار کہ دے جا خدا کے نام

گورِ غریباں

سید علی حیدر نظم طباطبائی

انگریزی شاعر گرے کی شہرۂ آفاق نظم ایلجی کا ترجمہ ہے۔ اصل نظم مقابلہ میں رکھ کر اسکو پڑھا جائے تو بیحد لطف آتا ہے

وداعِ روزِ روشن ہے گجر شامِ غریباں کا
چراگاہوں سے پلٹے قافلے وہ بے زبانوں کے
قدم گھر کی طرف کس شوق سے اٹھتا ہے دہقاں کا
یہ ویرانہ ہے میں ہوں اور طائر آشیانوں کے

اندھیرا چھا گیا دنیا نظر سے چھپتی جاتی ہے
جدھر دیکھو اٹھا کر آنکھ اُدھر اک ہو کا عالم ہے
مگس لیکن کسی جا بھیروں بیوقت گاتی ہے
جرس کی دور سے بیہم کبھی آواز آتی ہے

کبھی ایک گنبد کہنہ پہ بوم خانماں ویراں
فلک کو دیکھکر شکووں کے دفتر باز کرتا ہے
کہ دنیا سے الگ اک گوشۂ عزلت میں ہوں پنہاں
کوئی پھر کیوں قدم اس کنج تنہائی میں دھرتا ہے

قطار اک سامنے ہے مولسریوں کے درختوں کی
وہاں قبریں ہیں کچھ مٹی کی جیسے ڈھیر ہوتے ہیں
ہر اک نے مر کے بس دو گز کفن گز بھر زمیں پائی
بسانے والے جو اس گاؤں کے تھے سب وہ سوتے ہیں

نفس بادِ سحر کا نالۂ پر درد بلبل کا
ہوئے بیکار سب انکو اٹھا سکتا نہیں کوئی
رہی بیفائدہ مستوں کی ہو حق شور قلقل کا
ہیں ایسے نیند کے مارے جگا سکتا نہیں کوئی

نہ چولھے آگ ہی روشن نہ ہی انکی گھڑے پانی
نہ گھر والونکو اب کچھ کام ہے فکر شبستاں سے
نہ بی بی کو سر شام انتظار اب ہے، نہ حیرانی
نہ بچے دوڑتے ہیں اب کہ لپٹیں آکے داماں سے

وہی ہیں یہ جنہیں وقت درد مہلت نہ تھی دم بھر
وہی ہیں ہاتھ جلتی رہتے ہی تھے بشیر جنکے
وہی ہیں یہ جنہوں نے ہل چلائے گیت گا گا کر
بڑے سرکش درختوں کو گراتے تھے تبر جنکے

نہیں شایاں فخر و ناز نوبت اور نقارہ
جو نازاں جاہ و ثروت پر ہیں انپر موت ہنستی ہے
وہ ساعت آنیوالی ہے نہیں اس سے کوئی چارہ
کہ فانی ہے جہاں ہر اوج کا انجام پستی ہے

نظر آتے نہیں کتبے مزاروں پر تو کیا غم ہے
چراغاں اور صندل اور گل و ریحاں نہو تو کیا
نہیں مخمل اور کمخواب کی چادر تو کیا غم ہے
جو خوش آہنگ کوئی قاری قرآں نہو تو کیا

بناتے ہو بہو تصویر اگر مدفن پہ رکھنے کو
پلٹ کر اس میں کچھ نکلی ہوئی سانس آ نہیں سکتی
دعا ہو فاتحہ ہو مرثیہ ہو آہ و زاری ہو
کوئی آواز انکے کان تک اب جا نہیں سکتی

خدا جانے تھے ان لوگوں میں کیا کیا جوہر کامل
خدا معلوم رکھتے ہونگے یہ ذہن رسا کیسے

خدا ہی کو خبر ہے کیسے کیسے ہونگے صاحبدل　　خدا معلوم ہونگے بازوئے زور آزما کیسے

زمانے نے مگر کوئی ورق ایسا نہیں اُلٹا　　کہ بار فکر سے مہلت یہ پاتے سر اٹھانے کی
مصیبت نے طبیعت کی روانی کو کیا پس پا　　کہ یاد آنے نہ پاتی جوہر ذاتی دکھانے کی

بہت سے گوہر شہوار باقی رہ گئے ہونگے　　کہ جن کی خوبیاں سب مٹ گئیں تہ میں سمندر کی
ہزاروں پھول دشت و در میں بھی ایسے کھلے ہونگے　　کہ جنکے مسکرانے میں تھی خوشبو مشک اذفر کی

یہ صاحب عزم ہیں گو رزم کی نوبت نہیں آئی　　حکومت اپنے قریے میں کی لیکن دوست دشمن پر
وہ فردوسی یہ ہیں جنکی زباں کھلنے نہیں پائی　　وہ رستم ہیں نہیں سہراب کا خوں جنکی گردن پر

مقدر نے انہیں مصروف رکھا قلبہ رانی میں　　وگرنہ حکمرانی کا بھی جلوہ یہ دکھا دیتے
عجب کیا شہرۂ آفاق ہوتے خوش بیانی میں　　اور اپنے کارنامے اہل عالم کو سنا دیتے

رہے محروم نیکی سے بچے ہر اک برائی سے　　نہ زور مردم آزاری نہ شور فتنہ انگیزی
نہ دولت کی طمع میں بیگناہوں کے گلے کاٹے　　نہ کی خلق خدا کیساتھا بیرحمی و خونریزی

نہ صحبت میں امیروں کی کبھی خون جگر کھایا　　نہ اونٹایا لہو اپنا کبھی جھوٹی خوشامد سے
نہ ملکر روغن قاز آتش نخوت کو بھڑکایا　　کہ جس سے خودپسندوں کا تجبر بڑھ چلے حد سے

الگ ہر نیک و بد سے دور دنیا کی مکائد سے
گئے بیگانہ وار اور خلق میں بیگانہ وار آئے
رہے محفوظ دنیا سے زمانے کے مفاسد سے
قدم راہ توکل سے کبھی ڈگنے نہیں پائے

نہ دیکھ ان استخوانہائے شکستہ کو حقارت سے
یہ ہے گور غریباں اک نظر حسرت سے کرتا جا
نکلتا ہے یہ مطلب لوح تربت کی عبارت سے
جو اس رستے گذرتا ہے تو ٹھنڈی سانس بھرتا جا

لکھے ہیں نام ان قبروں پہ گو کا واک حرفوں میں
مگر بھولے ہوئے کو ٹھیک یہ رستہ بتاتے ہیں
زیادہ اس سے بڑھ کر اور کیا ہوگا اگر سوچیں
کہ جو مرنے سے ناواقف ہیں رستہ سیکھ جاتے ہیں

جو آیا ہے جہاں میں یاں سے جانا ہے اسے اک دن
یہ ہونا ہے کوئی چاہیگا دل سے یا نہ چاہیگا
مگر جاتے ہوئے پھر کر نہ دیکھے یہ نہیں ممکن
دلوں سے یاد ہی مٹ جائے یہ حاشا نہ چاہیگا

کوئی زانو کسیکا ڈھونڈھتا ہے دم نکلنے کو
کہ دیکھے اشک گرتے چاہنے والے کی دامن میں
کسی کی ہے یہ خواہش دوست کاندھا دے جنازے کو
پھر اس پر فاتحہ کی آرزو ہے کنج مدفن میں

حقیقت غور سے دیکھی جو ان سب بے نواؤں کی
تو ایسا ہی نظر آنے لگا انجام کا اپنا
انہیں کی طرح جیسے مل گئے ہیں خاک میں ہم بھی
یونہیں پرسان حال آ نکلا ہے اک دوستدار اپنا

یہ اس سے ایک دہقان کہن سال آ کے کہتا ہے
کہ ہاں ہاں خوب ہم واقف ہیں دیکھا ہے اسے اکثر
پھر اسکے بعد دل ہی دل میں کچھ غم کھا کے کہتا ہے
کہ اب تک پھرتا ہے آنکھوں میں پھرنا اسکا سبزہ پر

وہ اسکا نور کے تڑکے اودھر گلگشت کو آنا　　وہ پو پھٹنے سے پہلے آکے پھرنا سبزہ زاروں میں
وہ کچھ کم دن رہے اسکا لب جو کیطرف جانا　　وہ اُسکا مسکرانا دیکھکر شور آبشاروں میں

کبھی ایسی ہنسی لب پر کہ ظاہر جس سے کچھ نفرت　　ادا اسکے ساتھ ہی کچھ زیر لب کہتے ہوئے جانا
کبھی تیوری چڑھائے منہ بنائے رنج کیصورت　　کہ جیسے دل پہ صدمہ ہو زباں جسسے ہو بیگانہ

غرض کیا کیا کہوں اک روز کا یہ ذکر ہو صاحب　　کہ اس میداں میں پھرتے صبح دم اسکو نہیں دیکھا
ہوا پھر دوسرا دن اور نظر سے وہ رہا غائب　　خیاباں میں اسے پایا نہ دریا پر کہیں دیکھا

پھر اسکے تیسرے دن دیکھا کیا ہوں جنازے کو　　لئے آتے ہیں سب پڑھتے ہوئے کلمہ شہادت کا
تمہیں پڑھنا تو آتا ہوگا آؤ یاں سے دیکھو　　یہ اُسکی قبر ہے اور یہ کتابہ سنگ تربت کا

اب آغوش لحد میں سو رہا ہے چین سے کیسا　　گیا افسوس لیکن یہ جوان ناکام دنیا سے
دکھایا جاہ و شہرت نے نہ بھولے سے بھی منہ اپنا　　پھر ایسے نامرادوں کو بھلا کیا کام دنیا سے

ہر اک کے درد دکھ سے اسکو رہتا تھا سدا مطلب　　ہوا ممکن تو یاری کی نہیں تو اشکباری کی
دیا دست تہی کے ساتھ طینت میں کرم یارب　　میں تیری شان کے قربان کیا اچھی تلافی کی

خدا بخشے اسے بس دوست کا رہتا تھا وہ جویا　　تو نکلا دوست آخر اک خداوند کریم اُسکا
اب اُسکو نیک و بد کا ذکر کرنا ہی نہیں اچھا　　کہ روشن ہے خدا پر عالم امید و بیم اُسکا

سیر دیرہ دون

پنڈت برج نرائن چکبست

ولادت فیض آباد سنہ ۱۸۸۲ء وفات سنہ ۱۹۲۶ء

عجیب خطۂ دلکش ہے شہر دیرہ دوں ؛
یہیں بہار کا پہلے پہل ہوا تھا شگوں

نئی زمین نیا رنگ آسماں دیکھا
نگاہِ شوق نے کیا کہئے کیا سماں دیکھا

اگر پہاڑ ہیں جنت تو راستا ہے یہی
سنا جو کرتے تھے وہ باغ پر فضا ہے یہی

نشیب کوہ میں گہوارۂ بہار ہے یہ
ازل میں تھی جو فضا اسکی یادگار ہے یہ

یہ سبزہ زار سجایا ہے دست قدرت نے
کیا نہیں اسے غارت بشر کی صنعت نے

ہوائے سرد کو ہے حکم باغبانی کا
سُپرد ابر کے ہے انتظام پانی کا

جدھر نگاہ اُٹھی اسطرف ہی ہریالی
تمام شہر ہے گرد و غبار سے خالی

بجائے خاک کے اڑتا ہے رنگ سبزہ کا
لباس پہنے ہیں گل خشت و سنگ سبزہ کا

پہاڑ اسکو چھپائے ہیں اپنے دامن میں
اثر خزاں کا ہو کیا تازگی کے مسکن میں

لطیف و سرد ہوا پاک و صاف چشمۂ آب
گھنے درخت ہری جھاڑیاں زمیں شاداب

ٹھہر گئی ہے بہار آکے اِس گلستاں میں
کمی کبھی نہیں شادابیوں کے ساماں میں

کھڑے ہیں کوہ و شجر پہلوؤں میں صف بستہ
طلسمِ حسن کا ہے بیچ میں یہ گلدستہ

یہ سنتری نہیں پہلے سلام کرتے ہیں
یہاں جو آکے مسافر مقام کرتے ہیں

یہ سوچتا ہے پہاڑوں کو دیکھ کر انساں
جو دور جائیے بستی سے اور ہی ہے سماں

بشر پہ رعب یہ قدرت کا چھا گیا کیسا
یہ بل زمین کی تیوری پہ آ گیا کیسا

بلندیوں سے جو ہو مائل نشیب نظر
فریب دیتا ہے ندی کا پیچ و خم اکثر

نگہ کو دور سے پانی جو ہے نظر آتا
سپید ناگ چلا جا رہا ہے بل کھاتا

قریب ہوتا ہے آخر یہ دُور کا عالم
نگاہ دیکھتی ہے پھر سرور کا عالم

فضائے کوہ میں ایسی ہوا سماتی ہے
بشر کی روح کو راحت کی نیند آتی ہے

بس ایک عالم ہو چار سمت طاری ہے
نہ شور و شر ہے نہ دُنیا کی آہ و زاری ہے

اثر دکھاتا ہے قدرت کا نغمۂ دلگیر
شجر حجر سے ٹپکتی ہے راگ کی تاثیر

یہ راگ وہ ہے جو مضراب کا اسیر نہیں
یہ صرف کان کے پردوں میں گوشہ گیر نہیں

وہی سُنے گا اُسے دل گداز ہے جس کا
ہے دل میں سوز تو رگ رگ میں ساز ہے اسکا

یہ راگ مجھ میں سمایا سرودِ رے ہو کر
ہوس تھی رُوح کو ملجائے ہمیں لَے ہو کر

حریم خاص میں قدرت کی باریابی تھی
نگاہِ شوق میں اک شان بے حجابی تھی

نشست سنگ پہ تھی سایۂ شجر کے تلے
رواں تھا چشمۂ آب خنک نظر کے تلے

شریک حال تھی وضع قدیم قدرت کی
عیاں تھی سنگ و شجر سے کشش محبت کی

شرابِ اُنس حقیقی سے تھا ہر اک سرشار
شجر تھا کوہ تھا چشمہ تھا یا بہشت غبار

درخت و کوہ ہیں کیا ذات پاک انساں کیا
طیور کیا ہیں ہوا کیا ہے ابرِ باراں کیا

یہ موجِ ہستی بیدار کے عناصر ہیں
سب ایک قافلۂ شوق کے مسافر ہیں

یہ دل کے ٹکڑے ہیں قدرت کے انہیں غیر نہیں
سب ایک گود کے پالے ہیں کوئی غیر نہیں

انہیں سے نغمۂ قدرت ہے اوج و پستی میں
سب ایک ساز کے پردے ہیں بزم ہستی میں

جدا کسی سے بھی ہستی کا اُسکے راز نہیں
کچھ آبشار میں اور ہم میں امتیاز نہیں

ہے جسم خاک یہاں اُسکا جسم پانی ہو
اسی خیال میں طبع لطیف تھی سرشار
دل اپنے رنگ میں بیتاب تھا اس ارماں سے
اجل جو آئے تو اس کوہسار کے نیچے
غرض کہ روح کی آنکھوں سے یہ سماں دیکھا

جو روح ہم میں ہو اسمیں وہی روانی ہے
کچھ ایسی بے خبری تھی کہ ہوش اُسپہ نثار
کہ اس فضا میں ہو آزاد روح زنداں سے
بنے مزار کسی آبشار کے نیچے
ازل کے دن جو چھٹا تھا وہ آشیاں دیکھا

نیا سرور ملیتسر ہوا سفر کر کے
مگر نہ سیر حسن کر سکے نظر بھر کے

اندھی پھول والی کا گیت

(سید مہدی حسن احسن لکھنوی)

"شہر پمپئی کا عہد آخر" لارڈ لٹن کا مشہور ناول ہے اس میں ایک حصہ نظم ہے یونان کی ایک مادرزاد اندھی نوجوان و حسین لڑکی اٹلی میں بطور لونڈی فروخت کر دی گئی آقا اس سے یہ خدمت لیتا تھا کہ بازار میں روزانہ صبح و شام پھول فروخت کرے چنانچہ وہ ستارہ بجاتی اور گیت گا گا کر پھول فروخت کرتی اور دن بھر کی کمائی آقا کے حوالے کر دیتی تھی۔

گود میں مالن کی ہیں ٹوٹے ہوئے ڈالی کے پھول
تم ہو جس دنیا کے ساکن نور کی دنیا ہو وہ
ہو مبارک تم کو دنیا کے نظارے دیکھنا
میں وہاں ہوں ہو اندھیر اگھٹ جہاں چھایا ہوا

لو خریدار و یہ اندھی بیچنے والی کے پھول
عالمِ ظلمات مجھ مجبور کی دنیا ہے وہ
دن کو نورِ مہر شب کو چاند تارے دیکھنا
ہے تصور اس سیہ خانہ میں گھبرایا ہوا

تم کو قدرت نے عطا کی قوتِ نظارگی
اور ہیں محرومِ قدرت ۔ بندگی بیچارگی

نظمِ دنیا کا ہے جامِ جم تمہارے واسطے
تم ہو عالم کے لئے عالم تمہارے واسطے

فلسفہ قدرت کا ان پھولوں میں کھلاتی ہو نہیں
انمیں جو جو خوبیاں ہیں تمکو سمجھاتی ہو نہیں

طفلِ غنچہ بڑھ کے یہ آزاد گل بوٹے ہوئے
آگئے ہیں اپنی ماں کی گود سے چھوٹے ہوئے

وہم ہے نقش و نگارِ گل غلط ہی یہ گماں
عارضِ گل پر ہیں پیاری ماں کے بوسوں کے نشاں

باعثِ عبرت ہے ان کا عالمِ افسردگی
مادرِ گیتی سے چھٹ کر پائی ہے پژمردگی

نازپرورِ چمن ہیں یہ جو انانِ چمن
حسن کی دنیا کے ساکن ہیں یہ یارانِ چمن

کل کو دن تک تھے یہی سب طرہ دستارِ باغ
انکی رونق دیکھتی تھی نرگسِ بیمارِ باغ

دستِ گلچیں سے حفاظت دل میں تھے ٹھانے ہوئے
خارِ گلشن ہر طرف تھے برچھیاں تانے ہوئے

جب ہوئے پورے جواں تو ہوگئے عاشق مزاج
اب خود ان کو صاحبانِ حسن کی ہی احتیاج

آرزو یہ ہے کسی کا طرۂ دستار ہوں
خواہشیں یہ ہیں حسینوں کے گلے کا ہار ہوں

باوفا خود ہیں اور ہر حالت میں یہ دلسوز ہیں
اور حسینوں کو اتالیق وفا آموز ہیں

ہمدمِ راحت بھی ہیں اور غمگسارِ غم بھی ہیں
رونقِ شادی شریکِ محفلِ ماتم بھی ہیں

صرفِ بزمِ عیشِ معشوقِ ستم ایجاد بھی
اور کبھی زیبِ مزارِ عاشقِ ناشاد بھی

لو خریدارو چلو یہ بے رخی اچھی نہیں
رات بھر کی ہے یہ رونق صبح کو کچھ بھی نہیں

خندہ زن ہیں ایک شب کی زندگانی کیلئے
اپنے گھر لے جاؤ ان کو میہمانی کے لئے

ماتم داغ

(ڈاکٹر سر محمد اقبال)

عظمتِ غالب ہے اک مدت سے پیوندِ زمیں
مہدی مجروح ہے شہرِ خموشاں کا مکیں

توڑ ڈالی موت نے غربت میں مینائے امیر
چشمِ محفل میں ہے اب تک کیفِ صہبائے امیر

آج لیکن ہمنوا سارا چمن ماتم میں ہے
شمع روشن بجھ گئی بزمِ سخن ماتم میں ہے

بلبلِ دلی نے باندھا اُس چمن میں آشیاں
ہمنوا ہیں سب عنادل باغ ہستی کی جہاں

چل بسا داغ آہ میت اُسکی زیبِ دوش ہے
آخری شاعر جہاں آباد کا خاموش ہے

اب کہاں وہ بانکپن وہ شوخیِ طرزِ بیاں
آگ تھی کافور پیری میں جوانی کی نہاں

تھی زبانِ داغ پر جو آرزو ہر دل میں ہے
یعنے یہ لیلے وہاں بے پردہ یاں محمل میں ہے

اب صبا سے کون پوچھیگا سکوتِ گل کا راز
کون سمجھیگا چمن سے نالۂ بلبل کا راز

تھی حقیقت سے نہ غفلت فکر کی پرواز میں
آنکھ طائر کی نشیمن پر رہی پرواز میں

اور دکھلائیں گے مضمون کی ہمیں باریکیاں
اپنے فکرِ نکتہ آرا کی فلک پیمائیاں

تلخیِ دوراں کے نقشے کھینچ کر رلوائیں گے
یا تخیل کی نئی دنیا ہمیں دکھلائینگے

اس چمن میں ہونگے پیدا بلبلِ شیراز بھی
سینکڑوں ساحر بھی ہونگے صاحبِ اعجاز بھی

اٹھینگے آذر ہزاروں شعر کے بتخانے سے
مے پلائیں گے نئے ساقی نئے پیمانے سے

لکھی جائینگی کتابِ دل کی تفسیریں بہت
ہونگی اے خوابِ جوانی تیری تعبیریں بہت

ہو بہو کھینچے گا لیکن عشق کی تصویر کون
اُٹھ گیا ناوک فگن ماریگا دلپر تیر کون

اشک کے دانے زمینِ شعر میں بوتا ہوں میں
تو بھی روائے خاکِ دلّی داغ کو روتا ہوں میں

آہ اے بیت الحرامِ مذہبِ اہلِ سخن
ہو گیا پھر آج پامالِ خزاں تیرا چمن

وہ گلِ رنگیں ترا رخصت مثالِ بو ہوا
یعنے خالی داغؔ سے کاشانۂ اردو ہوا

تھی نہ شاید کچھ کششِ ایسی وطن کی خاک میں
وہ مہِ کامل ہوا پنہاں دکن کی خاک میں

اُٹھ گئے ساقی جو تھے میخانہ خالی رہ گیا
یادگارِ بزمِ دہلی ایک حالی رہ گیا

آرزو کو خون رُلواتی ہے بیدادِ اجل
مارتا ہے تیر تاریکی میں صیادِ اجل

کھل نہیں سکتی شکایت کیلیے لیکن زباں
ہے خزاں کا رنگ بھی وجہ قیامِ گلستاں

ایک ہی قانونِ عالمگیر کے ہیں سب اثر
بوئے گل کا باغ سے گلچیں کا دنیا سے سفر

تارے

سیّد محمد بے نظیر شاہ صاحب وارثیؒ

کہاں ہے تو اے ساقیِ بزم زیب
کہ تاروں بھری رات ہے دلفریب

کواکب یہ افلاک پھولے ہوئے
کنول حوضِ گردوں میں پھولے ہوئے

سمندر میں بہتے ہوتے یہ چراغ
بنے صحنِ گردوں میں تاروں کا باغ

نہیں چاند کا گو فلک پر نزول
کھلے ہیں گلِ چاندنی کے یہ پھول

مسہری سجی قدرتِ پاک کی
بسی سیج پھولوں سے افلاک کی

قنادیل روشن عجائب نگار مصابیح آیات پروردگار
ستاروں کا یہ عکس تالاب میں کہ لہراتی ہیں بجلیاں آب میں
تناسب سے قدرت نے چھوٹے بڑے زبرجد کے گنبد میں ہیرے جڑے
یہ خورشیدِ تاباں کے آنکے ہوتے گہر چتر گردوں میں ٹانکے ہوئے
غضب جگمگاتی ہوتی قندیاں بنا کامدانی کا تھان آسمان
بھری بوٹیوں سے ردائے فلک بنی بیل خود کہکشاں کی سڑک
شب تار کی شال تانے ہوئے جہاں نیند کی دل میں ٹھانے ہوئے
مگر چشم انجم جھپکتی نہیں ستاروں کی بوندیں ٹپکتی نہیں
کچھ ایسا ہی خوفِ شب تار ہے کہ ہر نجم اک چشم بیدار ہے
کھلے کوڑیالے سر کوہسار کہ شبنم سے بھیگا ہوا سبزہ زار
جو سیارے رہتے ہیں انہیں رواں وہ ہیں ان کی ترتیب کے پاسباں
جو ثابت ہیں محور بدلتے نہیں کہ گرد اپنے پھرتے ہیں چلتے نہیں
مرتب جو یہ شکل تجسیم ہے مہ و سال کی اس میں تقسیم ہے
ہوا بوجھ سب کا سنبھالے ہوئے فضا میں کروں کو اچھالے ہوئے
باہم ان میں جو ربط جذبات ہے علی قدر جسم و مسافات ہے
کشش ان میں ہے اور تاثیر بھی جداگانہ تکثیف و تنویر بھی
کچھ آباد کچھ ان میں خالی بھی ہیں جلالی بھی ہیں اور جمالی ہیں
وسیع اس قدر ہے فضائے جہاں ہیں ذروں سے کم یہ کرے بیکراں
تپش دن کو خورشید تابانکی تھی خبر کس کو اس بزم شایاں کی تھی

فضا آب انجم سے دھوئی ہوئی
شب ماہ حیرت میں کھوئی ہوئی

موسم بہار کا آخری گلاب

منشی درگا سہائے سرور جہان آبادی

(انگریزی شاعر "ٹامس مور" کی نظم "لاسٹ روز آف سمر" کا ترجمہ)

یہ آخری گلاب کا ہے یادگار پھول
بیکس غریب فرقت احباب میں ملول

اور شاخ پر کھلا ہوا تنہا چمن میں ہے
دھندلا سا اک چراغ سحر انجمن میں ہے

ہے کوئی غمگسار نہ ہمدم کوئی قریں
رخصت ہوئے چمن سے رفیقان ہم نشیں

بچپن کے آشنا ہیں وہ خاندان کے پھول
بکھرے پڑے ہیں خاک پہ اب گلستاں کے پھول

ننھی سی کوئی آہ کلی بھی نہیں قریب
یہ کچھ درد دل کا حال کہے جس سے غم نصیب

ڈالے جو عکس پھول سے رخ کا غریب پر
جو اسکی آہ سرد کو سنکر ہو نوحہ گر

کملانے دونگا تجھکو میں تنہا نہ شاخ پر
احباب سو رہے ہیں جہاں تیرے بے خبر

ڈر ہے نہ کنج میں تری مٹی خراب ہو
جا تو بھی انکے ساتھ ہم آغوش خواب ہو

کب تک زباں پہ فرقت احباب کا گلہ
ہیں محو خواب مرگ جہاں تیرے آشنا

اب تیری پتیاں میں بچھاتا ہوں خاک پر
تجھکو بھی انکے ساتھ سلاتا ہوں خاک پر

رخصت سفر اٹھاؤنگا میں بھی جہاں سے جلد
چھوٹونگا مر کے ہجر کے درد نہاں سے جلد

احباب مجھسے جب مرے ہو جائینگے جدا
تنہا کوئی جہاں میں جیا بھی تو کیا جیا

کیا لیکے کوئی آہ کرے عمر جاوداں
یاران رفتہ کا ہے زیارت کدہ جہاں

سلک وفا میں جب نہ رہے دُر آبدار
میری بھی بیکسی کا بنے گا وہیں مزار

جب اُٹھ گئے جہان سے یارانِ زندہ دل
جی کر غمِ فراق کے صدمے سہے گا کون

کڑیاں تری اٹھانیکو اے دردِ جاں گسل
اس غمکدے میں کے اکیلا رہے گا کون

پیغامِ عمل

(پروفیسر وحید الدین سلیمؔ)

مثلِ پروانہ تم اک پل میں جلنا سیکھو
تا سحر شمع کی مانند پگھلنا سیکھو

دل کو کرنا ہے اگر سوزِ محبت میں کباب
کروٹیں آگ کے بستر پہ بدلنا سیکھو

زندگی نام ہے حرکت کا تم افسردہ نہو
نبض کے خون کی مانند اُچھلنا سیکھو

عزم جو دل میں ہو پورا اُسے تم کرکے رہو
طفلِ سرکش بنو اور ضد سے مچلنا سیکھو

چشمۂ آب ہو تم سوتے ہو کیوں زیرِ زمیں
سنگِ خارا کے شگافوں سے ابلنا سیکھو

نڈر و صدمۂ طوفان سے مانند نہنگ
ورطۂ بحر کے آغوش میں پلنا سیکھو

آنچ سے رنج و مصیبت کی نہ کچھ خوف کرو
موم کی طرح ہر اک سانچے میں ڈھلنا سیکھو

ہے کٹھن منزلِ تسلیم تو پرواکیا ہے
سر کے بل دھار پہ تلوار کی چلنا سیکھو

کلفتِ دہر سے کیوں ناک چڑھاتی ہو ابھی
اس مئے تلخ کے دو گھونٹ نگلنا سیکھو

ہو کے پامالِ حوادث نہ ترقی سے رکو
دُوب کیطرح سے دب دب کے نکلنا سیکھو

تمت بالخیر